عنیزہ سید

نوید عید

اس روز کالج سے واپسی پر دیر ہو جانے کی وجہ سے خوامخواہ کی کوفت محسوس ہو رہی تھی اس پر زارا اس کی واپسی کے ساتھ ہی کسی خبر رساں ایجنسی کی طرح شروع ہو گئی۔

"چلو گول کرو تم بھی بوریا بستر" فیصلہ سنا دیا گیا "اجنبی خوش شکل بزرگ خاتون کو مبارک ہو۔ رخصت ہو رہی ہیں۔ آپ بھی میرے ساتھ۔" کوفت اور بے زاری نے جیسے اس کی سماعت ہی متاثر کر دی تھی۔ اس نے احمقوں کی طرح زارا کو دیکھا۔

"یقین نہیں آتا تو ابھی خود سن لینا امی سے۔ بزرگ خاتون کو جلدی تھی واپس جانے کی۔ انہوں نے تمہارے جوڑے کا ناپ لے لیا ہے' انگوٹھی کا ناپ میں نے دے دیا۔ یہ انگلی تو ہم دونوں کی ایک سی ہے نا!"

اس کی سماعت کے ساتھ باقی حواس بھی متاثر ہو گئے تھے۔ غالباً" کافی دیر بعد اسے امی کی آواز سنائی دی۔

"بات یہ ہے سارا! کہ میں آج جوتے چٹخاتے در در آئے ہوئے لوگوں کو منا چاہتی ہوں۔ کل کو خود جوتے چٹخاتے ہوئے دوسروں کو جا کر وے آنے کی قائل نہیں۔ یہ رشتہ مجھے' تمہارے ابا کو اور تمہارے بھائیوں کو بہت پسند آیا ہے' ان کو بھی شادی کی جلدی

مکمل ناول

ہے اور مجھے بھی۔ تم بھی زارا کے ساتھ رخصت ہو جاؤ تو میرے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو۔"

سارا واقعہ یہ تھا۔

اس نے شام کو لمبا غسل لینے کے بعد دل کا بوجھ کچھ کم ہونے پر سوچا۔ یہ بھی نہیں تھا کہ سب کچھ اس کے علم میں لائے بغیر بالا ہی بالا طے ہو گیا تھا۔ اجنبی' خوش شکل بزرگ خاتون پچھلے دو ماہ سے چکر لگا رہی تھیں۔ انہوں نے سارا کو خالہ کے بھانجے کی سالگرہ پر دیکھا تھا۔ جانے انہیں اس کی کون سی بات پسند آگئی تھی۔ حالانکہ آپی کا خیال تھا کہ اسے تقریبات میں جانے کا ڈھنگ بالکل نہیں آتا۔ اس روز بھی وہ زارا کے بخار کی وجہ سے گئی تھی۔ خاتون کو اپنے پوتے کے لیے رشتہ درکار تھا۔ جسے انہوں نے اس کی ماں کے ہوتے ہوئے بھی خود پالا تھا۔ وہ ان کے پہلی مرتبہ تھمنے کی ٹھنک گئی تھی۔ پچھلے برس زارا کے لیے جب اس کی ساس رشتہ لے کر آئی تھیں تو ان دنوں وہ بھی اس طرح کی باتیں کرتی تھیں۔ زارا ان خوبیوں پر بہت حد تک پورا اتری تھی لیکن سارا کا معاملہ قطعی الٹا تھا۔

"سمجھدار ہو' سلیقہ مند ہو۔" وہ قطعی نہیں تھی۔

"چار لوگوں میں رہنے کا قرینہ آتا ہو۔" یہ اسے بالکل ہی نہیں آتا تھا۔

"زیادہ پڑھنے لکھنے کی کیا ضرورت ہے؟" اسے بہت ضرورت تھی۔

"بس گھر گرہستی سنبھال لے ڈھنگ پٹاؤ نہ ہو۔"

اس میں نہ یہ مثبت خوبی تھی اور نہ ہی دوسری منفی۔

وہ مطمئن تھی اس کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر وہ خود ہی رفو چکر ہو جائیں گی۔ لیکن انہوں نے تو بقول آپی کے دہلیز کی مٹی لے لی تھی۔ اور انتہا یہ تھی جو آج امی نے سنائی تھی۔

"یہ رشتہ مجھے' تمہارے ابا کو اور بھائیوں کو بہت پسند آیا ہے۔" امی نے کہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ بات کہاں تک درست ہے۔ بے چارے ابا بہت دنوں بھائی کو سمجھا رہے تھے۔

"ان معاملوں میں اتنی جلدی نہیں کرتے۔"
"بہت دیر ہو جائے تو پچھتاوا ہی پچھتاوا رہ جاتا ہے۔" امی کا موقف تھا۔
"اور پھر سارا کی عمر ہی کیا ہے۔" وہ ٹھہرے لہجے میں پوچھتے۔
"وہ بھی پچھلے برس زارا کی تھی جب اس کا رشتہ طے ہوا تھا۔" امی اطمینان سے جواب دیے جاتیں۔
"کچھ دیکھنا بھالنا تو چاہیے۔" وہ اصرار کرتے۔
"کوئی فیصلہ کریں اور دیکھیں بھالیں ویسے بھی میں رضامند ایسے ہی نہیں ہوئی۔ بے حد شریف خاندان ہے۔ دادی نماز روزے کی پابند اور خاموش طبع، باپ دیانتداری کی روٹی کماتا تھا حق حلال کی۔ ماں دادی کی طرح تہجد گزار اور چپ چاپ، بہنیں فرشتہ سیرت، بیٹے باپ کا عکس، دو بڑے باہر ہوتے ہیں۔ گھر بھر دیا مگر اکڑ غرور کا نام نہیں۔"
امی نان اسٹاپ شروع ہو جاتیں۔ ابا کو آخر میں ہار ماننی ہی پڑی۔ اور بھائیوں کی بھی خوب کی۔ سجاد بھائی کو بہت سے کام امی سے رہتے تھے، وہ امی کے آگے بولنے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ ان کے بہت سے مفادات کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو جاتا تھا۔ زبیر بھائی سدا کے لاپروا تھے۔ وہ بس ہوتے کو دیکھنے کے عادی تھے۔ کیوں ہوا؟ اور کیسے ہوا؟ اس میں انہیں کبھی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ ہاں اس معاملے کو سننے کے بعد انہوں نے ایک بار یہ ضرور کہا تھا۔
"سارا! سارا تو بہت چھوٹی نہیں ابھی لیکن خیر۔"
پھر جیسے انہیں امی کا مسئلہ سمجھ میں آگیا۔ اور بے چارہ جاوید تو خیر کسی گنتی میں نہیں تھا۔ اس کی رضامندی یا اعتراض کے کوئی معنی نہیں تھے۔ آپی اور بھابی اس بات پر خوش تھیں کہ گھر میں ایک ساتھ دو شادیاں ہوں گی۔ خوب رونق رہے گی۔
"اور یہی سارا واقعہ تھا۔" اس نے سارے معاملے پر غور کرنے کے بعد سوچا۔
امی کو جب سے ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ ان کے دل میں عجیب سے وہم گھر کرنے لگے تھے۔ پچھلے سال انہوں نے جس طرح دھڑا دھڑ زارا کا رشتہ طے کیا تھا وہ ان ہی کی ہمت تھی اور یہ رشتہ تو گویا بیٹھے بٹھائے ان کی گود میں آن گرا تھا۔ نعمت غیر مترقبہ کے طور پر۔ وہ شک کرنے کی عادی نہیں تھیں، جو لوگ محبت سے ملتے ہیں۔ ان کا شکریہ اندر سے وہ بچھے ہیں اپنے لیے ہیں۔ پچھلے برس زارا کی ساس کی محبت پر بھی انہوں نے کوئی شک نہیں کیا تھا اور گزرے ایک سال نے ثابت کر دیا کہ ان کا فیصلہ درست تھا۔ اور اب سارا کے لیے بھی وہ مطمئن تھیں اور کسی نے ان سے اختلاف نہیں کیا تھا۔
سب باری باری جا کر سب کچھ دیکھ کر مطمئن ہو آئے تھے۔ اعتراض کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ ابھی بزرگ خاتون جو کہ اب بہت شناسا ہو چکی تھیں کو شادی کے بعد حج کرنے جانا تھا اور اس کے بعد اپنے بیٹے کے پاس ابوظہبی۔ ان کا ویزا لگ چکا تھا اور ان کے بڑے پوتے کی شادی تیار تھی۔ وہ چھوٹے کی شادی بھی اسی کے ساتھ کرنا چاہتی تھیں۔ سو وہ سب آناً فاناً ہوا۔ اس کے بارے میں سارا کے خوش آئند دل نے یہ سوچا تھا کہ کسی نہ کسی وجہ سے ٹل جائے گا مگر یہ ممکن نہیں ہو سکا اس کی ساری خوش فہمیاں دھری کی دھری رہ گئی تھیں۔ اس روز امی کی بہت منت کے بعد جب آخری بار وہ سہیلیوں سے مل کر کالج سے واپس آئی تو اس نے اپنا کتابوں کا بیگ اپنی الماری کے سب سے نچلے خانے میں گھسا دیا۔

☆ ☆ ☆

اس کے منصوبے بہت اعلا یا بہت زیادہ آگے جانے کے نہیں تھے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ یونیورسٹی لیول تک پڑھ لے اور پھر کوئی ہنر سیکھ لے۔ ناموافق حالات کے لیے خود کو تیار کر لے۔ اس کی اس سے بڑی کوئی خواہش ہی نہیں تھی۔ اسے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ زارا کی منگنی پر اس نے بہت حیرت سے اس سے پوچھا تھا۔

"ہائے تو اب تم پڑھو گی نہیں؟"
زارا کی بات دوسری تھی، وہ اسی میں خوش تھی۔ جبکہ اس کے خواب بڑے خوش کن تھے۔ وہ ڈگری لے رہی ہے، اس کے پاس بہت اہم اپائنٹمنٹ لیٹر ہے، اس کی وجہ سے ابا کا سر بلند ہے۔ اسے معلوم تھا کہ آخری انتہا یہی ہوتی ہے۔ امی کی بیماری کے بعد وہ ذہنی طور پر اس کے لیے تیار بھی ہو رہی تھی لیکن اتنی جلدی کا تو تصور بھی نہیں تھا۔
ابھی تک تو وہ بے انتہا بے فکری اور مزے کی زندگی گزارتی آئی تھی۔ وہ سب سے چھوٹی تھی۔ ابا اور بھائی اس کو خصوصی توجہ دیتے تھے۔ امی کا دھیان سب میں بٹا تھا۔ اور اس کو امی کی بے دھیانی محسوس بھی نہیں ہوتی تھی۔ اس کی پڑھائی میں، اس کے ہر شوق میں، اس کے کہیں آنے جانے میں، اس کے کھانے پینے میں سجاد بھائی اور ابا خاص طور سے دلچسپی لیتے تھے۔ وہ اپنی دنیا میں مگن ہر گزرتے دن کو الوداع اور نئے دن کو خوش آمدید کہتی تھی۔
پچھلے ایک سال سے وہ زارا کی شادی کی منتظر تھی۔ آپی کی شادی پر وہ بہت چھوٹی تھی۔ سجاد بھائی کی شادی پر اچانک بیمار پڑ گئی تھی۔ شادی کا پورا ہفتہ اس نے بخار میں گزارا۔ زارا کی شادی میں وہ بھرپور طریقے سے شریک ہونا چاہتی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ گھر کی اس تیسری شادی میں بھی اس کو اس طرح شریک نہیں ہونے دیا جائے گا۔ وہ اس سچویشن کو آہستہ آہستہ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔
اس دوران اجنبی بزرگ خاتون جن کو سب بی بی جان کہتے تھے۔ کئی بار آئی تھیں۔ دو دفعہ ان کے ساتھ اس کی ہونے والی ساس اور سسر بھی تھے۔ ایک بار بیٹے، جیٹھانی ہر بار وہ اس سے اس کی پسند کے رنگ پوچھتیں "اسے کپڑوں پر ہلکا کام پسند ہے یا بھاری؟ کام قمیص پر بھی ہو یا صرف دوپٹے پر؟ زیور جڑاؤ اچھا لگتا ہے یا سادہ؟ اور ہر بات کے ساتھ اپنی رائے ضرور دیتیں۔
"اسفند کو ہلکے رنگ پسند ہیں۔"
"بھاری کام تو چبھتا ہے۔"
"جڑاؤ زیور کیا ہوا اترانا گا۔ زیور سادہ ہونا چاہیے بلکہ کوئی اصول تو ہو۔"
اسے ان چیزوں کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ ریشمی کپڑا اسے ویسے ہی پسند نہیں تھا۔ تقریبات کے لیے زبردستی بنوانا پڑتے تھے۔ کپڑوں پر کام بھی بڑی دقت پیدا کرتا تھا۔ دوپٹہ کہیں جاتا اور خود کہیں۔ زیور سونے کا چھوڑ کبھی آرٹیفیشل بھی نہیں پہنا تھا۔ زارا اپنے ٹاپس والے ڈبے میں تاک جھانک کے بعد اس کے کپڑوں سے ملتے جلتے رنگ کے چھوٹے موٹے ٹاپس زبردستی اس کے کانوں میں اڑس دیتی۔ وہ بھی صرف شادی بیاہ کے موقع پر۔ آدھی تقریب کے بعد وہ انہیں چپکے سے اتار کر بھابی کے پرس میں رکھ دیتی۔ اس کا ان باتوں میں تجربہ بہت محدود تھا۔ اس لیے وہ خاموشی سے ان کی

شکل دیکھتی رہتی۔ اس کے بجائے۔ امی یا بھابی جواب دے دیتیں۔

اصل میں وہ ایک عجیب سے شاک میں جاتی تھی۔ ایک دم سے کسی چیز کے کھو جانے کا غم‘ احساس جدائی‘ ابھی تو اس نے کچھ بھی نہیں دیکھا تھا۔ کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ ایک یہی دکھ اس پر آسیب کی طرح چھا گیا۔ وہ کسی سے کچھ کہنے کی عادی نہیں تھی۔ دل کی بات اندر ہی رکھتی لیکن اب اس کا دل چاہتا۔ کوئی اس کی سنے‘ وہ کسی سے کچھ کہے۔ لیکن گھر میں ہر شخص مصروف تھا۔ کبھی کبھار مانی ماموں آ جاتے۔ وہ ان کے سامنے ہی ایک دفعہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتی تھی۔ لیکن وہ تھوڑی دیر ٹھہرتے ہر بات کو ہنسی میں اڑا کر ہلا گلا مچا دیتے۔

"دیکھ لو‘ ایک ہی سال میں مقابلے پر دوسرا آ گیا ہے۔ تم اپنے انجینئر صاحب کو سمجھا دو‘ ہم نے ایک اور انجینئر ڈھونڈ نکالا ہے‘ اب بچ کر رہیں۔" وہ زارا سے کہتے۔

"سارا بھئی! موصوف ٹھہرے سول انجینئر۔ گھر تو خوب ہی جلدی بنائیں گے تمہارے لیے۔" وہ اس کو مخاطب کرتے۔

"وہ کیا اور گھر بنائے گا‘ یہ بڑا گھر بنایا ہے۔ انہوں نے نیا سمن آباد میں سات بیڈ رومز اٹیچ باتھ روم کا‘ اتنا بڑا تو لان ہے ان کے گھر کا اور بھئی کیوں نہ بنائیں دونوں بڑے بھائی باہر جو ہوتے ہیں ابوظہبی میں۔" بھابی جن کی وساطت سے یہ نیا رشتہ آیا تھا ہاتھ ہلا کر جواب دیتیں‘ بھابی باہر رہنے والوں سے نجانے اتنی متاثر کیوں تھیں۔

☼ ☼ ☼

دن پر لگا کر اڑ رہے تھے۔ امی نے دن رات ایک کر کے اس کے حصے کا سارا کام دو مہینوں میں کیا۔ گدے‘ لحاف‘ تکیے انہوں نے سب پہلے ہی سے بنا کر رکھے تھے۔ لحاف بھروانے کا کام تھا۔ باقی کا سارا جہیز وہ دس سال پہلے سے ان دونوں کے لیے بنا رہی تھیں۔ کچھ بیشی اب پوری ہو رہی تھی۔ زارا سب تیاریوں میں پیش پیش تھی۔ یہ سوٹ‘ یہ نیل پالش‘ وہ سوٹ‘ وہ سینڈل جبکہ اس کا اپنا دل اڑا اڑا سا رہتا تھا۔ جوں جوں دن گزرتے جا رہے تھے اس کے چہرے کی رونق ختم ہو رہی تھی۔ پھر ایک روز مانی ماموں بھانپ ہی گئے۔

"کیوں بھئی سارا! کیا بہت یاد آتے ہیں انجینئر صاحب؟" وہ سنجیدہ بات بھی مذاق ہی میں کرتے تھے۔

"کیوں پریشان ہو؟" اب وہ واقعی سنجیدہ ہو گئے۔ بس اتنی ذرا سی ہمدردی کی وہ منتظر تھی۔ اس کی آنکھوں سے جھر جھر بہتے آنسوؤں نے ان کو بالکل ہی بوکھلا دیا۔

"کیا مطلب ہے سارا! مجھے بتاؤ۔ ہم اچھے دوست ہی ہیں نا؟" وہ گھبرا کر پوچھ رہے تھے۔ "تمہارے ساتھ کوئی زیادتی تو نہیں ہو رہی۔ میرا مطلب ہے کہ تم کہیں اور..."

"نہیں!" اسے کرنٹ لگا اور ساتھ ہی آنکھیں بھی خشک ہو گئیں وہ کچھ اور ہی سوچنے لگے تھے۔

"میں ابھی پڑھنا چاہتی تھی اور مجھے ڈر لگتا ہے۔" اس نے سادگی سے وجہ بیان کی۔

"کمال ہے سارا!" وہ جھلا گئے۔ "تم نے تو مجھے ڈرا دیا تھا۔ ارے بھئی‘ بہت پڑھ لیا تم نے۔ بڑا علم ہے تمہارا‘ یہ خالی ڈگریوں کا بوجھ لادنے کا شوق تمہیں کیوں ہے؟ اور پھر لڑکیاں تو اس عمر میں پڑھائی چھوڑ اور جلد از جلد شادی کی خواہش مند ہوتی ہیں۔ باقاعدہ وظیفے کرتی ہیں‘ اس کے لیے تمہارا دماغ کیوں خراب ہے؟"

"میں اب نارمل ہوں گی۔" اس نے بڑی آسانی سے اعتراف کیا۔

"نہیں‘ تم بالکل نارمل ہو‘ اور اس معاملے کو بھی نارمل ہی لو۔ یہ تو ہونا ہی ہوتا ہے۔ کل کے بجائے آج ہو گیا۔ آپا نے جلدی تو کی ہے‘ مگر وہ بھی شاید ٹھیک ہی کہتی ہیں‘ تم بس ان کا خیال کرو۔"

"لیکن مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"یہ بھی تمہاری بے وقوفی ہے۔ ارے بھئی‘ ہر انجانی چیز سے ڈر لگنا تو لازم ہے‘ ایک نئی زندگی کا آغاز

تمہیں صرف پری میریٹل ٹینشن ہو رہی ہے۔ باقی کوئی بات نہیں ہے۔ تم ہنسو کھیلو اور خوش رہو‘ ورنہ انجینئر صاحب کہیں گے مار پیلا زرد چہرہ میرے پلے باندھ دیا ہے۔"

مانی ماموں تسلیاں دینے کے ماہر تھے۔ ان سے بات کر کے اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا اور اس نے قدرے مطمئن ہو کر آگے کے ارادے اور مستقبل کے خواب اپنی دوسری چھوٹی چھوٹی چیزوں کے ساتھ الماری میں رکھ کر تالا لگا دیا۔

☼ ☼ ☼

وقت سرعت سے گزر گیا اور وہ دن آ ہی پہنچا جس کے لیے خاندان بھر جمع تھا۔ گھر میں موجود سب لوگوں کو اپنی اپنی پڑی تھی۔ رنگوں‘ روشنیوں اور گیتوں کی بہار تھی۔ اس کی اور زارا کی سہیلیاں اس پر رشک کر رہی تھیں۔

"اتنی جلدی! اچھا ہوا تم چھوٹ گئیں‘ پڑھائی سے۔" ان میں سے کسی نے کہا تھا۔

گھر کا ہر فرد مصروف تھا۔ سجاد بھائی تو ابا کے ساتھ لگے ہوئے ہی تھے۔ شادی کے دنوں میں زبیر بھائی بھی اپنی ڈھیر ساری مصروفیات چھوڑ کر ادھر متوجہ تھے۔ امی کو دم بھر بھی سانس لینے کی فرصت نہیں تھی۔ پھر بھی وہ ان دونوں کے پاس گھڑی دو گھڑی آ کر بیٹھ جاتیں۔ مہندی کے روز جب سب لوگ کھانا کھانے میں مصروف تھے۔ ابا اتنے دنوں میں پہلی بار ان کے کمرے میں آئے۔

"تمہاری امی نے تمہارے لیے بہتر فیصلے ہی کیے ہوں گے‘ کیونکہ کوئی ماں اپنی اولاد کے لیے برا نہیں چاہتی۔" انہوں نے ان دونوں کو بازوؤں کے گھیرے میں لے کر کہا تھا۔ "یہ ایک نئی زندگی کا آغاز ہے۔ تمہاری اب تک کی زندگی میں میں نے تم لوگوں کو وہ سب مہیا کرنے کی کوشش کی ہے جو میرے بس میں تھا۔ اب تک تمہاری بہتر زندگی کے لیے جدوجہد کرنا میرا کام تھا لیکن اب ایک بہتر زندگی گزارنے کے لیے تم لوگوں کو خود کوشش کرنا ہو گی۔" وہ آہستہ آہستہ کہہ رہے تھے۔

"ابا کیا کہہ رہے تھے؟" ان کے جانے کے بعد زارا نے اچانک چونک کر پوچھا۔

"تم نے خود کیوں نہیں سنا؟" اس نے روکھے پن سے جواب دیا۔

"میرا دھیان مہندی کی طرف تھا۔ دیکھو‘ اس سائیڈ سے تو جھڑ بھی گئی۔ نجانے انجم کہاں چلی گئی‘ ذرا دوبارہ سے لگا دیتی۔"

اس نے اگر سنا نہیں تھا تو اسے کوئی خاص دلچسپی بھی نہیں تھی کہ ابا نے کیا کہا تھا۔ یہ زارا کی سدا کی عادت تھی جو بات وہ دھیان سے سننا نہیں چاہتی تھی۔ وہ وہاں موجود ہوتے ہوئے بھی جہاں وہ بات کہی جاتی اس نے نہیں سنی تھی‘ بقول مانی ماموں کے وہ اپنے کانوں کے سوئچ آف کر لیتی تھی۔ اور پھر چونک کر پوچھتی۔ "اس نے کیا کہا تھا؟"

"ابا نے کہا ہے کہ اب بہتر زندگی بنانے کے لیے تمہیں خود کوشش کرنا ہو گی۔" قدرے توقف کے بعد اس نے آہستہ سے کہا۔ اسے معلوم تھا کہ زارا اب بھی نہیں سن رہی۔ وہ اپنی مہندی کے ڈیزائن میں الجھی تھی۔ نجانے وقت طلب باتیں ہمیشہ اسے ہی سننے اور سمجھنے کو کیوں ملتی تھیں۔

شادی کا دن ہنگامے اور شور سے شروع ہوا۔ دونوں باراتیں لاہور سے آنا تھیں۔ لیکن اس کی بارات پہلے پہنچی۔ اس کے معاملے میں نجانے ہمیشہ ہی جلدی کیوں ہو جاتی تھی۔ بارات کے استقبال کرنے والوں کے تبصرے جاری تھے۔ دولہا اور اس کے کپڑوں پر بحث زور و شور سے ہو رہی تھی پھر زارا کی بارات پہنچی۔

"زارا کے دولہا نے شیروانی پہنی ہے‘ سارا کا دولہا یونہی سوٹ پہن آیا بھلا کیا ضرورت ہے لاٹ صاحب بننے کی‘ ایک ہی تو دن ہوتا ہے۔" بڑی خالہ خود کلامی کرتے ہوئے گزریں۔ ان کی خود کلامی ہمیشہ کی طرح بلند آواز میں تھی۔

نکاح کے بعد اس نے لان میں کھلنے والی کھڑکی سے باہر دیکھا۔ اس کی بڑی نند لان کے بیچوں بیچ کرسی پر چڑھی بری کا ایک ایک جوڑا گھما گھما کر دکھا رہی تھی۔

"توبہ توبہ بھلا بری دکھانے کی کیا تک ہے خوامخواہ شو آف۔" بڑی خالہ نے ایک مرتبہ پھر خود کلامی کی۔

"کتنا چیپ لگتا ہے۔" کسی نے اس کے پیچھے سے کہا۔

"پھر کیا ہوا' ان کے ہاں کی رسم ہوگی۔" کسی دوسرے نے جواب دیا۔ لیکن اس کا دل بھر آیا تھا۔

"لوگ صرف ان ہی پر تبصرے کر رہے ہیں۔ کیا نوید اور اس کے گھر والے ان کو نظر نہیں آتے۔" اس نے خاموشی سے سوچا۔

ان دونوں کو سجانے سنوارنے میں انجم نے اپنا پورا آرٹ صرف کیا تھا۔ لیکن دیکھنے والوں کا کہنا تھا کہ سارا' زارا سے زیادہ اچھی لگ رہی ہے کیونکہ اس نے پہلے کبھی میک اپ نہیں کیا تھا۔

"ندیدیٹ دونوں سالے کے سالے۔" بڑی خالہ کی خود کلامی جاری تھی۔ اس نے کن انکھیوں سے زارا کی جانب دیکھا۔ اس کی ہنسی حسب معمول بند نہیں ہو رہی تھی۔ لوگوں کے تبصروں کا بوجھ بھاری زیور کے ساتھ لاد کر وہ زارا کے ساتھ باہر آگئی۔

"دیکھنا' غلط جگہ پر مت بٹھا دینا۔" کسی نے ہانک لگائی۔ لیکن یہ غلطی کس کو لگ سکتی تھی۔

جس اجنبی نامانوس شخص کے ساتھ اس کو بٹھایا گیا تھا اس کے چمکتے جوتوں پر پینٹ کے پائنچے بجے تھے اس کی نظریں صرف اس جگہ تک ہی پڑ رہی تھیں۔ زارا کے ساتھ بیٹھے نوید کے کھتے کی چمک تو گئی آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ آپی اور اس کی کزنز ان دونوں کے ساتھ ہنسی مذاق کر رہی تھیں۔ نوید کی آواز بہت بلند تھی' وہ ان کو چھیڑ رہا تھا۔ نیگ پر جھگڑ رہا تھا۔ اس کے ساتھ تو گویا کوئی بے جان بت رکھا تھا۔

"اسفند پہلی بار آیا ہے نا بھئی' فرینک نہیں ہے ابھی۔" کسی کے استفسار پر آپی نے کہا تھا۔

"آپ لوگوں کو جو کچھ لینا ہے' آرام سے لیں نا۔" بت میں اچانک جان سی پڑی۔ جتنی سنجیدگی کے ساتھ یہ جملہ کہا تھا اتنی ہی سنجیدگی کے ساتھ نیگ کا معاملہ اس سے طے کیا گیا۔ اور پھر سارے مرحلے اسی طرح طے ہوئے۔ اس کی سسرال والوں کو رخصتی کی جلدی تھی۔

"کل بھی بارات کے ساتھ گئے۔ آج بھی آئے لوگ تھک گئے ہیں۔ اس لیے اجازت دیں۔" بی بی جان' سارا کو ساتھ لگائے امی سے کہہ رہی تھیں۔

جس طرح اس کی بارات جلدی آئی تھی اسی طرح رخصتی بھی پہلے ہوئی۔ اس کا حلق اور آنکھیں خشک تھیں۔ اس کا محرک انجم کی وہ ہدایات تھیں جو وہ مسلسل اس کے پیچھے چیختی آرہی تھی۔

"دیکھو' رونا نہیں۔ سارا آئی لائنر اور مسکارا بہہ جائے گا۔ سارے چہرے پر دھبے پڑ جائیں گے۔" یا پھر دل میں مسلسل اٹھتے وہم اور وسوسے۔ جو بھی تھا۔ امی' ابا' بھائیوں اور آپی سے ملتے ہوئے اس کی آنکھ میں ایک آنسو بھی نہیں آیا تھا۔

"بریو گرل سارا! حوصلہ اس طرح کرتے ہیں۔" جب بابی ماموں نے اسے اپنے ساتھ لگا کر کہا تھا اس کے اندر کہیں پانی ہی پانی پھیل گیا۔ مختصر سفر اس کو بہت طویل لگا کرتے تھے' یہ تو اچھا خاصا طویل سفر تھا۔ اوپر سے کانوں میں پڑے جھمکے اور سر پر رکھا بھاری دوپٹہ کا وجود توڑے ڈال رہے تھے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا سب کچھ یہیں چھوڑ چھاڑ گاڑی سے چھلانگ لگا دے۔ مگر یہ صبر کا پہلا مقام تھا اب تک اس نے جبر اور صبر نے ہی تھے کیے نہیں تھے۔ یہ تجربہ بہت بھیانک معلوم ہو رہا تھا۔

"کیا خیال ہے' پانی وغیرہ پی لیں' کوئی کولڈ ڈرنک؟" گاڑی چلانے والے نے پوچھا۔ اس کو سخت پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ اس لیے کان کھڑے ہوگئے۔

"کیوں اسفند؟" اس کے ساتھ بیٹھی بی بی جان نے پوچھا۔

"کیا ضرورت ہے رکنے کی۔ اب گھر چل کر ہی۔" کوئی اور موقع ہوتا تو وہ ایسی بات کہنے والے کو بہت کچھ

سناتی لیکن اس شخص کو بہت کچھ سنانے کا فی الحال کوئی موقع نہیں تھا۔

"تھک گئی ہو گی' اچھی طرح ٹیک لگا لو' دیکھو شاید تمہاری بہن کی گاڑی بھی پیچھے آرہی ہوگی۔" بی بی جان نے اس کی پشت پر ہاتھ پھیرا۔

اجنبی ماحول اور اجنبی لوگوں میں وہ پریشان حال گھری بیٹھی تھی۔ کوئی چہرہ اسے اپنا نہیں لگ رہا تھا۔

"کیا تھا جو امی میرے ساتھ کسی کو بھیج دیتیں۔" وہ روہانسی ہو کر سوچ رہی تھی۔

وہ آنسو جو رخصت کے وقت کہیں گھٹ گئے تھے اب امڈے چلے آرہے تھے جنہیں پونچھ پونچھ کر ہاتھ میں پکڑا سفید ٹشو پیپر کالا سیاہ ہو رہا تھا۔ ڈھیروں ڈھیر بچے اس تخت پر سے بار بار چھلانگیں لگا رہے تھے جس پر وہ بیٹھی تھی۔ رشتہ دار خواتین جب اس کا گھونگھٹ اٹھا کر چہرہ اوپر کرتیں تو کانوں میں پڑے کئی بالے اور ناک میں پڑی تیج والی نتھ ہل جاتی لیکن اس کی ہائے سب کی سماعتوں سے باہر تھی۔ پھر اس کی جیٹھانی ایک دن پہلے کی بیاہی دلہن آگئی۔

"ہائے خالہ جی اتنی چھوٹی؟" اس نے بھی اس کا سر اسی طرح ہلا کر اس کا چہرہ بلند کیا تھا۔

"بی بی سے پوچھو۔" کہیں سے جواب ملا۔

"اور بھیجیں اس کو' نہیں تو ختم ہو جائے گی۔"

یہ انداز گفتگو اس قدر نامانوس تھا کہ اس کو ہضم کرنے میں پندرہ منٹ لگے۔ اور پھر اس کو اٹھا کر ایک اور کمرے میں لے جایا گیا۔ کمرے کی سجاوٹ بتا رہی تھی کہ یہی آخری ٹھکانہ ہے اس کے آگے اسے کہیں اور نہیں لے جایا جائے گا۔ تنہائی پاتے ہی اس نے دوپٹہ پیچھے کھسکایا اور ناک کان کو ہاتھ لگایا۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ اب یہ ہاتھ تک لگائے جانے کے قابل نہیں ہیں۔ اس نے انہیں اتارنا چاہا اسی وقت بی بی کمرے میں آگئیں۔

"نہ نہ بیٹا! ابھی وقت نہیں ہے۔" انہوں نے منع کیا۔ "میرے بچے سرکار کی رضا سے آج تم اس گھر میں آگئیں۔ اب مجھے کوئی فکر نہیں۔" انہوں نے بستر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"فکر نہ کرو' سب تمہارا ہے میں نے اسفند کو خود پالا ہے۔ میرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سرکار کا کرم ہے۔ میرا بڑا فرمانبردار ہے۔ اللہ سوہنا تمہیں خوشیاں دے۔" انہوں نے کچھ پڑھ کر اس پر پھونکا اور پھر اپنے ساتھ لائی ہوئی ٹرے اس کے سامنے رکھی۔

"روٹی کھاؤ۔" اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔

"نہ نہ بیٹی سوہنے رب کے رزق سے انکار نہیں کرتے' ناشکری ہوتی ہے۔" انہوں نے نوالہ زبردستی اس کے منہ میں ٹھونسا۔

"کچھ نہ کھانا تم لوگ۔ بس اسٹرا سے دودھ وغیرہ پی لینا۔" اسے انجم کی ہدایت یاد آئی۔

"تمہارے اپنے گھر کا کھانا ہے یہ تو۔ کھاؤ اللہ کی رضا سے' اب تم اس گھر کے دسترخوان میں شامل ہوگئی ہو۔ وہ سائیں میرا' رزق میں برکت ڈالے گا۔ تمہارے دم قدم سے۔" بی بی جان کی گفتگو جاری تھی۔ وہ خاموشی سے کھانا حلق سے اتارتی گئی۔

"اب آرام کرو۔ میں اسفند کو بھیجتی ہوں جا کر۔ سب آرام کریں۔ دو باراتوں کے تھکے ہوئے۔" وہ جاتے جاتے دروازہ بھیڑ گئیں۔

"یہاں لوگ کس طرح باتیں کرتے ہیں۔" اس نے حیرت سے سوچا۔ وہ نیم غنودگی میں تھی جب دروازہ دوبارہ کھلنے کی آواز آئی۔ وہ اجنبی نامانوس شخص اندر آچکا تھا۔

"آپ اسی طرح بیٹھی ہیں۔ آپ ایزی ہو جائیں کپڑے بدل کر۔" پہلا جملہ کس قدر پر تکلف۔ وہ پوری طرح بیدار ہوگئی۔ وہ باتھ روم میں گھس گیا۔ دس منٹ بعد جب وہ باہر نکلا تو سلیپنگ سوٹ میں تھا۔

"آپ چینج کر لیجیے اور سو جائیے۔" وہ دھڑام سے بستر پر پڑتے ہوئے بولا۔

کافی دیر وہ اس سچویشن کو سمجھنے کی کوشش کرتی رہی۔ پھر جیسے اس میں اچانک کوئی قوت آگئی۔ تیزی

سے اٹھ کر باتھ روم میں گھس گئی۔ اس کا قلالین کا نائٹ سوٹ کیل پر لٹکا تھا۔ کپڑے بدلتے ہوئے منہ پر بچے سارے لوازمات پھر ٹل گئے۔ لیکن اب تک اس میں برداشت آچکی تھی۔ زبردستی آچکی تھی۔ زبردستی کھینچ کھانچ کر اس نے وہ سب کچھ اتارا۔

"جب اس کو جس کے لیے وہ اشنہ کر رہی تھیں۔ دیکھنے کا کوئی شوق نہیں تو کیا فائدہ سجائے رکھنے کا۔"

گرم گرم آنسوؤں کے ساتھ پانی کے چھینٹے مارتے ہوئے اس کے ماؤف ذہن نے سوچا۔ کانوں اور ناک پر خون جم گیا تھا اور دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد جب وہ باتھ روم سے نکلی تو صبر اور جبر کے دوسرے تجربے سے دوچار ہو چکی تھی۔ زیور سائیڈ ٹیبل کی دراز میں رکھ کر بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر اس نے لحاف اپنے اوپر اوڑھا اور ٹھنڈے ذہن سے سوچنا شروع کیا۔ اس کے قریب پڑا شخص ایک دفعہ پھر کروٹ میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اس کے سانس تک کی آواز نہیں آرہی تھی لیکن وہ جانتی تھی کہ وہ گہری نیند سویا ہوا ہے۔

"زارا کے افسانوں اور شادی شدہ کزنز کی باتوں میں یہ کچھ تو نہیں ہوتا تھا جو میرے ساتھ ہوا۔"

اس نے آنکھیں بند کر کے سوچا۔ کیا اس کو نیند اس قدر پیاری ہے کہ سب کے بقول یہ اہم رات سو کر گزار دی جائے۔ یہ کیا کہ کوئی بات تک بھی نہ کی جائے جیسے معمول کا دن ہو۔ شاید بے چارہ دو باراتوں کا تھکا ہوا ہے۔

اس نے خود کو مطمئن کرنا چاہا۔ ٹیبل لیمپ بجھانے سے پہلے اس کا دل چاہا ایک بار اسے اچھی طرح دیکھ تو لے لیکن اسی لمحہ اس نے دوسری طرف کروٹ بدل لی۔

☼ ☼ ☼

پوری رات وقفے وقفے سے اس کی آنکھ کھلتی رہی۔ نئی جگہ پر نیند اسے کبھی نہیں آتی تھی لیکن یہ شاید دن بھر کی تھکن کا اعجاز تھا جو اس کی آنکھ لگ جاتی تھی۔ صبح دروازے پر دستک سے جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے دن کی روشنی میں اپنے ساتھ پڑے بُت کی طرف دیکھا۔ وہ اسی کروٹ لیٹا تھا جس پر رات کو تھا۔ دروازے پر دستک تیز ہوئی تو وہ ہڑبڑا کر اٹھا۔ نیند کھلنے کے بعد کچھ دیر اس نے حالات کو سمجھنے میں لگائی اور پھر سلیپر پہن کر دروازے کی جانب تقریباً بھاگا۔

"ایسی بھی کیا نیند بھئی؟" یہ اس کی بڑی نند باجی شمیم تھیں۔ وہ ان کے اندر آنے تک دروازے سے چپکا کھڑا رہا۔ ان کے اندر آنے کے بعد چپکے سے باہر نکل گیا۔

"ہائے غرارہ سوٹ کرسی پر کیوں رکھ دیا۔ الماری میں لٹکا دیتا تھا ہینگر پر۔" وہ اس کے قریب آتے آتے ٹھٹک گئیں۔

"آٹھ ہزار کا غرارہ سوٹ ہے۔ آج بھی پہننا تو... ہماری طرف کے ملنے والوں نے تو دیکھا بھی نہیں... کوئی شو ہی نہیں بنی۔ وہ تمہاری بہن کے سسرال والے تو بازار کا بنا بنایا لے گئے تھے۔ وہ ڈھائی ہزار والا آتشی گلابی میں نے تو آپا کو کہا تھا۔ پہلے دن کے لیے وہی لے لو پر ان کو بڑا شوق تھا۔ مہنگا جوڑا ہی پہلے دن پہننا ہے۔ لو اب دوبارہ استری کرنا پڑے گا۔"

وہ نان اسٹاپ بول رہی تھیں۔ وہ شخص جس کے نام کے توسط سے وہ یہاں تک آئی تھی اس کو بلکی شیر کے نرغے میں چھوڑ کر کیسا دم دبا کر بھاگا تھا۔

"ناشتہ کیا کرتی ہو؟ بی بی جان اپنے وظیفے سے فارغ ہوتیں تو خود پوچھتیں۔" انہوں نے غرارہ جھاڑتے ہوئے کہا۔

"دیکھو، یہ یہاں پڑا تھا۔ سارا وٹ ووٹ ہو گیا۔" دوسرا جملہ انہوں نے پیچھے آتی بڑی بھابی سے کہا۔

بڑی بھابی کے پیچھے لوگوں کا ہجوم تھا۔ کوئی اسفند کی ... ماہی تھیں کوئی چچی کوئی صرف رشتے داروں کی رشتہ ... رات تو شاید اس کی شکل دیکھ دیکھ کر ان کو تسلی نہیں ہوئی تھی۔ وہ دوبارہ اس کا چہرہ اٹھا اٹھا کر دیکھ رہی تھیں۔ اس کی چھوٹی نند عاصمہ ناشتے کی ٹرے اٹھا...

اس کے قریب آگئی۔

"شمیم! رات والا سالن نہیں بچا جو دلہن کے ساتھ آیا تھا اور چاول؟" کہیں سے آواز آئی۔

"کہاں باجی جی، سالن میں شوربا نام کو نہیں تھا۔ منٹوں میں ختم ہو گیا اور چاول اتنے سخت، کھانے کے قابل تھے بھلا، ہم نے تو رات کو خود روٹیاں پکائی تھیں، چاول تو امی نے بھیج دیے تھے۔ پکی بھٹی، خالہ رضیہ کی طرف، وہ بانٹ دیں گی لھوری واسوں میں۔ وہاں بہت ہوتے ہیں۔"

یہ بات انہوں نے بیڈ کور کی شکنیں نکالتے ہوئے اس کے کانوں میں تقریباً منہ گھسیڑ کر کہی تھی۔ اس کا دل ہول گیا۔ اس کے گھر کے کھانے کی سب ہی نے تو تعریف کی تھی بارات کے ساتھ آنے والوں نے بھی۔ اب نجانے ایک دم برا کیسے ہو گیا تھا۔

"چلو کوئی تو اللہ سوہنے کی مخلوق کھائے گی لھوری واسں بھی اسی پاک معبود کی مخلوق ہوتے ہیں۔"

ایک مانوس آواز اس کے قریب سے آئی۔ اس نے گردن گھما کر دیکھا، وہ تسبیح پڑھ رہی تھیں۔

"پرسوں بھی تو آیا تھا کھانا زری کے ساتھ کیسا پورا ہوا تھا۔" باجی شمیم کا افسوس جا نہیں رہا تھا۔

"اچھا! اب ذرا کمرہ خالی کرو۔ دلہن ناشتا تو کرے سکون کے ساتھ۔" انہوں نے اس پر کرم کیا۔ اور کمرہ منٹوں میں خالی ہو گیا۔

"پھر کیسا لگا اسفند؟" انہوں نے آگے جھک کر پوچھا۔ نوالہ اس کے حلق میں پھنس گیا۔ جو شخص رات گیارہ بجے سے صبح آٹھ بجے تک بغیر کچھ کہے مسلسل سوتا رہا ہو وہ کیسا لگ سکتا تھا۔

"اللہ سوہنے کے کرم سے بڑے گن ہیں اس میں، بڑا فرمانبردار ہے۔" انہوں نے خود ہی جواب دے کر اس کی مشکل آسان کر دی۔ وہ اس کی تعریفوں میں مشغول تھیں، جب وہ کمرے میں واپس آیا۔ وہ بغیر ادھر ادھر دیکھے باتھ روم میں گھس گیا تھا۔

"تو میں نے تو پوچھا تھا دلہن کیسی لگی؟"

انہوں نے برتن سمیٹتے ہوئے کہا۔ ان کے جانے کے بعد اس نے ایک بار پھر کمرے کا جائزہ لینا شروع کیا۔ یہ یقیناً ان پانچ بیڈ رومز میں سے ایک تھا جن کے بارے میں بھائی نے بتایا تھا، درمیان میں اس کے جہیز کا ڈبل بیڈ تھا جو تین دن پہلے سامان کے ساتھ پہنچا تھا۔ اس کے پیچھے دو شلف بنے تھے۔ ایک سائیڈ پر دو کرسیاں، ایک تپائی، فرش پر قالین کا چھوٹا ٹکڑا اور ایک ڈریسنگ ٹیبل۔ چیزیں سب اپنی اپنی جگہ پر تھیں لیکن سب ہی پر گرد کی ایک دبیز تہہ بتا رہی تھی کہ انہیں کپڑے کی جھاڑ کھائے کافی عرصہ ہو گیا اس کا جائزہ ابھی مکمل نہیں ہوا تھا۔

جب وہ باتھ روم سے نکلا سامنے کرسی پر بیٹھ کر اس نے ہاتھ میں پکڑے تولیے سے گیلے بال رگڑنا شروع کیے۔ کافی دیر اس مشغلے میں مصروف رہنے کے بعد وہ اٹھا اور ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں خود کو گھورتا ہوا بال بنانے لگا۔ اس کے ہر عمل سے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کمرے میں تنہا ہو۔

"یا خدا! یہ بولتا کیوں نہیں ہے؟" اس کی خاموشی پر اس نے گھبرا کر سوچا۔ اس بات کا تو اسے یقین تھا کہ وہ بولنے سے قاصر نہیں ہے۔ لیکن اس کی مکمل خاموشی کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

"کیا دو باراتوں کی تھکن ابھی تک نہیں اتری؟" اس نے دوسری بات سوچی۔

اپنے حلیے سے مطمئن ہو کر وہ باہر کی طرف چلا۔ دروازہ کھلا اور بہت سے مانوس چہرے اندر آگئے۔ ایک دم ان سسرالی رشتہ داروں کو دیکھ کر وہ گھبرا گیا تھا یا ویسے ہی تقریباً بھاگ نکلا تھا۔ سب سے ملتے ہوئے اس نے دھیان نہیں دیا۔ وہ سب زارا کے ولیمہ کے لیے آئے تھے۔ سارا اور زری کا ولیمہ شام کو تھا۔

"ہم نے سوچا، پہلے تم سے ملتے جائیں۔ امی ابو تو سیدھے زارا کی طرف گئے ہیں۔ شام کو آئیں گے۔" اس کی آنکھوں میں رات بھر کی اٹھائی کوفت اور دکھ کے آنسو آنے لگے۔

"ہائے سارا! رو رہی ہو؟" آپی نے چونک کر دیکھا۔ "ایسے ہی ہوتا ہے، شروع شروع دل نہیں لگتا

تلے میں بھی کئی دن روتی رہی تھی۔"

"کیا آصف بھائی بھی یونہی خاموش رہتے تھے پہلے۔" اس نے آپی کا تجربہ سن کر سوچا۔ حالانکہ ان سے زیادہ باتونی آدمی سارا نے کہیں اور نہیں دیکھا تھا۔

"نئی جگہ ہوتی ہے۔ بندہ ایڈجسٹ نہیں کر سکتا اتنی جلدی۔" انجم نے خیال ظاہر کیا۔

"تم یہ تو بتاؤ۔ کیسے ہیں اسفند بھائی؟" وہ اس چلتے پھرتے خاموش بت کے بارے میں کیا خیال ظاہر کرتی۔

"انہوں نے کیا دیا؟" سعدیہ نے پوچھا۔

"ایک طویل اور خاموش رات۔" وہ خاموش بیٹھی ہر بات کا جواب محض سوچتی۔

"سوہنے' پیارے' جیون جوگے لوگ آئے ہیں آج میرے گھر میں۔" بی بی اندر داخل ہوئیں۔

آپی اور بھابی تجربہ کارانہ انداز میں ان سے ملنے لگیں۔ پھر وہ ان کے ساتھ زری کے کمرے کی طرف چلی گئیں۔ اور وہ اپنی کزنز کے ان سوالوں کے جواب دینے لگی جن کے جواب درحقیقت اس کو نہیں آتے تھے۔ کچھ دیر بیٹھنے کے بعد وہ لوگ زارا کی طرف چلے گئے۔

☼ ☼ ☼

شام کو باجی شمیم نے اسے استری شدہ چمکتا غرارہ دوبارہ پہنوا کر میک اپ کر کے باہر لا بٹھایا۔ اس کے قریب ہی زری بیٹھی تھی اب اس کو اپنے رشتہ داروں سے باقاعدہ متعارف کروایا جا رہا تھا۔ اس نے اپنے دونوں جیٹھ اس وقت ہی دیکھے۔

"اس دلہن کا اپنی طرف کا زیور تو بڑا ہی ہلکا ہے۔" باجی شمیم کی ساس نے جو بہت دیر سے ادھر بیٹھی تھیں کہا۔

"اپنی اپنی حیثیت ہے نا امی جی! یہ تو بی بی سے پوچھیں۔" باجی شمیم نے اکتائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

بی بی سارے لان میں گھومتے ہوئے ہر ایک کے صدقے ہو رہی تھیں۔ امی کو دیکھ کر اس کی آنکھیں ایک بار پھر دھندلا گئیں۔ امی بی بی کا خلوص اور پیار دیکھ کر نہال ہو گئیں۔ بی بی اس کی ساس کو کھینچ کھانچ کر امی کے قریب لا رہی تھیں۔

"ہائے سارا! آج بھی وہی غرارہ پہن لیا۔ وہ کیوں نہیں پہنا آنے والا بنارسی سوٹ۔" زارا نے اس کے قریب آتے ہی کہا۔

"میں نے تو صبح وہی پہنا تھا۔" اس نے سر اٹھا کر زارا کو دیکھا اس کا چہرہ ہمیشہ کی طرح تھا' چمکتا دمکتا مسکراتا۔

"اور تمہارا میک اپ کس نے کیا ہے' یا اللہ! میں پہلے ہی آ جاتی۔" انجم اپنے بیٹے کے منہ میں فیڈر ٹھونستے ہوئے چونکی۔

یکایک اسے محسوس ہوا کہ وہ ایک دن کی دلہن ہوتے ہوئے بھی ان سب سے زیادہ بوسیدہ اور پرانی لگ رہی ہے۔

"میں تو آج صبح سے تیار ہو کر آئی تھی۔ دیکھو اب تک ویسے کی ویسی ہوں۔" زارا نے کہا۔

"اور کیا ملا تمہیں؟ مجھے یہ ڈائمنڈ کا رنگ دیا ہے نوید نے۔" اس نے انگلی لہرائی۔

"تمہیں کیا دیا اسفند نے؟" اس کے پاس کسی بھی سوال کا جواب نہیں تھا لیکن اس کا دل نیچے ہی نیچے جا رہا تھا جیسے بیٹھ گیا ہو۔

"ہیلو بھئی!" مانی ماموں' زبیر بھائی اور جاوید کے ساتھ ادھر آئے۔ "بھئی' اب تو تمہارا احترام کرنا پڑے گا۔ تم ہو اب شادی شدہ خاتون اور ہم ٹھہرے چھڑے چھانٹ۔" ان کا لہجہ وہی پرانا تھا۔

"کچھ بھی تو نہیں بدلا لیکن شاید قسمت کے سوا۔" یکایک اس پر انکشاف ہوا۔ اس نے سامنے دیکھا وہ سجاد بھائی کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔

"اچھا بھلا تو بولتا ہے۔ میرے ساتھ اسے باتیں کرتے ہوئے کیا موت تھی۔"

امی کا ارادہ دونوں بیٹیوں اور دامادوں کو ساتھ لے جانے کا تھا۔ نوید اور زارا جانے کے لیے تیار ہو کر

آئے تھے لیکن اپنے کمرے میں اپنے چھوٹے اٹیچی میں چیزیں رکھتے ہوئے اس نے سنا کہ اسفند نہیں جا رہا۔

"سو دفعہ جاتا خوشی سے اس برکتوں والے گھر میں۔ لیکن کل بھی پرسوں بھی شادیاں ہیں اس کے دوستوں کی۔ شادیوں کا تو سیزن ہے' آج کل بس روز روز۔" کمرے کے وسط میں کھڑی بی بی امی کو بتا رہی تھیں۔

"کہنے لگا سارا آج چلی جائے' میں آپ لوگوں کے ساتھ چلا جاؤں گا لینے کے لیے۔"

وہ کہہ رہی تھیں۔ وہ لاکھ کم عمر اور انجان سہی مگر ارمان تو اس کے دل میں بھی تھے۔ کل سے آج تک اس کے ساتھ اس کے دیکھے سنے کے بالکل برعکس کیوں ہو رہا تھا۔ اس نے اٹیچی زور سے بند کی۔

اسد اور زری بھی زری کے میکے جانے کے لیے تیار تھے۔ یہ معمول کے خلاف باتیں اسی کے کھاتے میں کیوں لکھی جا رہی تھیں۔

"سارا زیور لے جا کر کیا کرو گی؟ یہ ہلکا والا سیٹ رکھ لو۔" باجی شمیم اس کی تیاریوں میں بھی مداخلت کرنے کے لیے سر پر کھڑی تھیں۔ اس نے سارے ڈبے ان کو پکڑا دیے۔

انہیں کس چیز کی فکر تھی۔ وہ جان نہیں پا رہی تھی لیکن جب وہ امی کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی اس کا دل خواہش کر رہا تھا کہ کاش اس گھر میں گزرا یہ آخری دن ہو۔ لیکن کوئی احمقانہ خواہش کم ہی پوری ہوا کرتی ہے۔ اس نے خود ہی سوچا۔

اپنا گھر' اپنا کمرہ' کتنا شاندار تصور تھا۔ گزری ایک رات نے اسے بہت سی نعمتوں کی حقیقتوں سے آگاہ کر دیا تھا۔ یہاں سب کا سوال تھا۔

"سارا کا میاں کیوں نہیں آیا؟ لو بھلا دوستوں کی شادیاں ان دو تین دنوں کے لطف سے زیادہ اچھی ہوتی ہیں بھلا۔" پھر کئی طرح کے تبصرے۔

"سارا کے سسرال والے کچھ اکھڑے اکھڑے معلوم نہیں ہوتے۔"

"ویسے تو سارا کا میاں زارا کے میاں سے زیادہ خوش شکل ہے لیکن روکھا سا لگا مجھے تو۔" بڑی خالہ کی خود کلامی۔

اسے قسمت کے بدل جانے کا یقین کچھ زیادہ ہونے لگا۔

"وہ سارا کی دادی ساس تو بڑی چالاک سی لگتی ہے۔ ہر ایک کے صدقے واری ایسے ہی لوگ جاتے ہیں۔ اس کی اپنی ساس تو بڑی مزاج دار سی لگتی ہے۔"

جن لوگوں سے اس کی آشنائی صرف چند گھنٹوں کی تھی' ان کے بارے میں سب اس سے سوال کر رہے تھے۔ اس نے گھبرا کر سب کی باتوں میں قہقہوں میں پناہ لے لی۔ یہ رشتہ اس نے خود تو نہیں جوڑا تھا جو وہ ان باتوں پر شرمندہ ہو رہی تھی۔

"یہ لوگ زارا کے سسرال والوں کا تذکرہ کیوں نہیں کرتے؟" اس نے سوچا۔

"زارا کے مزے ہیں۔ ایک ساس ہی ہے اور کوئی جھنجھٹ نہیں ہے۔ لمبی سسرال داری تو سارا کی ہے۔ آپا تم نے کیا کیا؟ بے چاری سارا کی عمر ہی کیا تھی۔" چھوٹی خالہ نے امی سے کہا۔

"بس رہنے دو' تم لوگوں نے دیکھا ہی کیا ہے' بی بی تو قربان جاتی ہیں اس پر۔ اور باقی بھی سب اچھے ہیں۔ ایک دن میں تم نے کیسے اندازہ کر لیا۔" امی نے سختی سے جواب دیا۔

"امی کو اتنا اطمینان ہے تو ٹھیک ہی ہو گا۔" اس نے خود کو مطمئن کرنا چاہا۔

☼ ☼ ☼

تیسرے دن ہی اس کی سسرال سے فون آ گیا۔ بی بی کا ٹکٹ اگلے دن کا تھا اور وہ چاہتی تھیں کہ سارا ابھی آ کر ان کو رخصت کرے۔ تین دن یوں گزرے تھے جیسے اس کو اب یہیں رہنا ہے۔ کہیں جانا نہیں۔ لیکن یہ خوش کن خواب ہی تھا۔

اس کا دل چاہتا تھا کہ کسی کو تو بتائے کہ اس ایک رات میں ہی اس پر کیا گزری۔ امی کا اطمینان تو تھا ہی قابلِ رشک۔ اور پھر وہ ذہنی طور پر ان کے اتنے قریب

تھی ہی نہیں۔ لبا بھی بی بی کے حسن سلوک اور محبت سے بہت متاثر نظر آتے تھے۔ سجاد بھائی خود سے ہی سب کو بتاتے رہے تھے کہ خدا کے فضل سے زارا اور سارا دونوں ہی بہت خوش ہیں۔ زبیر بھائی اپنی دلچسپیوں میں دوبارہ سے مشغول ہو چکے تھے۔

آپی ولیمہ کے اگلے روز ہی واپس چلی گئی تھیں اور مانی ماموں تو ولیمہ سے واپس تو شہو ہی چلے گئے تھے۔ یہاں آئے ہی نہیں تھے۔ زارا اپنی خوشیوں میں مصروف تھی اور یہ بات اس سے کہنے کی تھی بھی نہیں۔ وہ بہت جاننے کے باوجود کسی کو کچھ نہ بتا سکی۔ اور بی بی اس کو لینے آ گئیں۔ ان کے ساتھ اسفند اور اس کی ساس بھی تھیں۔ اس نے ڈرائنگ روم میں جھانک کر دیکھا وہ سب سے ہی دھیمی آواز میں باتیں کر رہا تھا۔ امی اس کے آگے بچھی جا رہی تھیں۔ آخر کو داماد یوں پہلی بار آیا تھا۔

"شاید اس روز یہ واقعی دو باراتوں کا تھکا ہوا تھا۔" اس نے اس خوشگوار ماحول کو دیکھ کر سوچا۔

واپسی کا سفر اس دن کی طرح خاموشی میں گزرا۔ لیکن آج اس کے اوپر بھاری کپڑوں اور زیورات کا بوجھ نہیں تھا۔ آج وہ گاڑی خود چلا رہا تھا۔ اس کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بی بی بیٹھی تھیں۔ ہمیشہ کی طرح قربان ہوتی ہوئیں اس روز کی طرح آج بھی اس نے کہیں رک کر پانی نہیں پیا تھا۔

گھر مہمانوں سے خالی تھا۔ باجی شمیم ابھی ادھر ہی تھیں اور ان کے بچے بھی۔ شادی کا دن کب کا گزر چکا تھا لیکن اس گھر میں ابھی تک اس کے نشان باقی تھے۔ باہر سجاوٹ کے لیے جو کاغذی آرائش کی گئی تھی وہ ابھی تک اتاری نہیں گئی تھی۔ لان میں کاغذ ڈبے اور پھولوں کی مرجھائی پتیاں اسی طرح بکھری تھیں۔ اندر کا حال بھی مختلف نہیں تھا۔ اس کا دل چاہا اٹھ کر خود صفائی شروع کر دے لیکن صبر اور جبر کے مراحل بڑی ترتیب سے اسے اپنا آپ دکھا رہے تھے۔

یہاں آنے کے فوراً بعد ہی سے اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ بی بی کے علاوہ گھر کے باقی لوگ اس سے کچھ کھنچے کھنچے سے ہیں۔ بی بی گھر کے جس فرد کے بارے میں پوچھتیں، معلوم ہوتا کہ زری کے کمرے میں ہے۔ بی بی نے اس کو اپنے ساتھ زری کے کمرے میں چلنے کو کہا۔

زری کے کمرے کی سجاوٹ قابل دید تھی۔ اس کے اردگرد سب گھر والوں کا ہجوم تھا۔ اس کے دونوں جیٹھ اور باجی شمیم کے میاں بھی یہاں ہی موجود تھے۔ اسفند کی دونوں خالائیں بھی موجود تھیں۔ ایک خالہ زری کی امی تھیں۔ دوسری قریب ہی کسی بستی میں رہتی تھیں۔ یہ سب اسے بی بی بتا رہی تھیں اور وہ ایک کونے میں بیٹھی ہونقوں کی طرح سب کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایسے موقعوں پر کیا کرنا چاہیے۔ وہ خود اٹھ کر ان میں جا بیٹھے یا اس بات کا انتظار کرے کہ وہ اس سے کوئی بات کرتے ہیں۔

"تم بیٹا! بیٹھو یہاں۔ میں دو سجدے اپنے پاک پروردگار کے حضور کر آؤں۔" بی بی بہت دیر تک کمرے میں موجود ہر شخص پر قربان ہونے کے بعد اٹھ چلی گئیں۔

ان کے جانے کے بعد اسے اپنا یہاں موجود ہونا اور بھی بے معنی سا لگنے لگا۔ وہ سب اپنی باتوں میں مصروف تھے۔ کس شادی پر کس نے کیا پہنا تھا؟ کون کیا پہن کر آیا تھا؟ کس نے کتنا کھانا کھایا تھا؟ پھر شادی کی مووی لگا دی گئی۔ سب چھوٹے بڑے انہماک سے مووی دیکھنے لگے۔

"ہائے بڑی ٹوٹی پھوٹی گڑیاں ہیں اسفند کے سسرال کی۔" کسی نے پیچھے سے کہا اس نے چونک کر اسکرین کی طرف دیکھا۔ وہ بہت سے لوگوں کے ہجوم میں آہستہ آہستہ چلتا گھر کی طرف آ رہا تھا۔

دروازے پر ابا اور امی کھڑے تھے۔ چھوٹی خالہ، سجاد بھائی، بھابی کتنے مانوس چہرے، یکایک اپنی تنہائی کا احساس دور ہو گیا۔ پھر اس کا اپنا چہرہ نمودار ہوا۔ اس نے خود کو غور سے دیکھا۔

"کیا میں کسی قابل بھی نہیں لگ رہی تھی۔" اس کے دل میں ہوک سی اٹھی پھر وہ اس کے برابر ابا کے سہارے چلتی گاڑی تک پہنچی تھی۔ اس کے ساتھ بیٹھی تھی۔

اس نے نظریں ادھر ادھر گھمائیں۔ وہ واپسی کے فوراً بعد ہی سے غائب تھا۔ زری اور اسد بھائی کو ساتھ ساتھ بیٹھے دیکھ کر اس کا دل گھبرانے سا لگا۔ اسے اس گھر کے مختلف کمروں میں جانے کے راستے معلوم نہیں تھے۔ لیکن پھر بھی اس نے ہمت کر ڈالی اور خاموشی سے اٹھ کر باہر نکل آئی۔

اس روز اس نے دروازے کا سفید رنگ غور سے دیکھا تھا۔ ادھر ادھر پھر کر اس نے سفید رنگ والے دروازے کا ہینڈل ہی گھمایا۔ اس کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ کمرہ وہی تھا لیکن اس کا حلیہ بے حد مختلف تھا۔ اس کے جہیز کا تقریباً سارا سامان اس کمرے میں ٹھونس دیا گیا تھا۔ فریج ایک کونے میں پڑا تھا۔ ٹی وی اس کے اوپر، بڑے صوفے پر دونوں چھوٹے صوفے اوندھے پڑے تھے۔ تپائیاں ایک کے اوپر ایک۔ واشنگ مشین کے اوپر سیونگ مشین اور اس کے ساتھ کھڑا پیڈسٹل عجیب منظر پیش کر رہا تھا۔

اس بکھرے پڑے کمرے کو دیکھ کر اس کا دل ہولنے لگا۔ اسے بے ترتیبی سے ہمیشہ کی نفرت تھی۔ کچھ دیر کے لیے اسے بھول گیا کہ یہ اس کی سسرال کا گھر ہے۔ اسے صرف یہ یاد تھا کہ اس کا کمرہ ہے اور اسے یہاں اس بے ترتیبی میں نہیں رہنا۔ اس نے دوپٹہ بیڈ پر پھینکا اور جت گئی۔ دو گھنٹے کی کھینچا کھانچی کے بعد اس کو کچھ تسلی ہوئی لیکن اس کا جسم ٹوٹنے لگا تھا۔ سب چیزوں کو اپنی سمجھ کے مطابق ٹھکانے لگا کر وہ پلٹی۔ عین اس کے پیچھے نجانے وہ کب سے کھڑا تھا۔ کچھ دیر چپ چاپ کھڑا رہنے کے بعد وہ الماری کھول کر کچھ ٹٹولنے لگا۔ صوفے پر تقریباً گرتے ہوئے اس نے خود سے کچھ کہنا چاہا لیکن اسی وقت دستک کے ساتھ ہی کوئی اندر آ گیا۔

"اچھے ہو بھائی تم۔ خالہ رضیہ صبح کی آ کر بیٹھی ہیں۔ تمہارے لیے اور تم یہاں بیوی کے ساتھ سامان درست کرنے میں لگے ہو سجاوٹوں کا اتنا بھی کیا شوق۔" بغیر کسی تصدیق یا تردید کے وہ ان کے پیچھے باہر نکل گیا۔ اس کو حیران پریشان چھوڑ کر۔

"اس نے یہ تک نہ کہا کہ میں نے تو کچھ نہیں کیا۔" اس کو اسی ایک نکتے پر حیرت نے بہت دیر تک ستایا۔

"ہا! بی بی نے آ کر اس کی حیرت کو توڑا۔ "ٹھیک کر لیا کمرہ چلو اچھا ہے۔ میں نے کہا تھا صفیہ سے خود کرے گی سارا آ کر اپنی مرضی کا۔ ابھی ایسے ہی رہنے دو۔ اچھا کیا دونوں نے مل ملا کر اپنا کام کر لیا۔" وہ بھی اسی غلط فہمی میں مبتلا تھیں۔ وہ اپنی کمر کا درد لیے اسی طرح خاموش بیٹھی رہی۔

"اب میں چلی جاؤں گی اپنے رب سچے سرکار کی مرضی ہے۔ سارا بیٹا! میں صدقے اب اس گھر کو اپنا سمجھنا سب کچھ تمہارا ہے۔ اس پاک پروردگار کے کرم سے کسی کی کوئی بات بری لگے تو تھوک چھوٹا ہوتا ہے ہو جاتا ہے بڑا، کچھ بندہ دل بڑا رکھے تو وہ سچا سرکار بھی فضل کرتا ہے۔ وہ کسی چیز کی کمی نہ رکھے۔ باقی تو سب کچھ ہے تمہارے لیے ہی ہے۔"

وہ دیر تک اسے سمجھاتی رہیں۔ وہ اپنے وظیفے کے لیے اٹھ کر گئیں تو وہ باتھ روم میں گھس گئی۔

"الگ باتھ ہیں ان کے گھر میں۔" اسے بھابی کی بات یاد آئی۔ پہلے دن بھی اور آج بھی باتھ روم کو دیکھ کر اس کا دل گھبرانے لگا۔ کسی زمانے میں اس باتھ روم کے سرامکس سفید رنگ کے ہوں گے لیکن اب سب چیزیں ناقابل برداشت حد تک پیلاہٹ کا شکار ہو چکی تھیں۔ فرش پر داغ پڑ چکے تھے۔ گیلا اور بند ہونے کی وجہ سے اس میں مخصوص بو بس رہی تھی۔ اس نے جلدی سے منہ دھویا اور باہر نکل آئی۔ عاصمہ اسے کھانے کے لیے بلانے آئی۔

کھانے کی میز بہت وسیع و عریض تھی۔ اور کھانے والے بھی بہت زیادہ تھے۔ وہ آخر کرسی پر ٹک گئی۔ چمچوں اور باتوں کے شور میں کسی نے اس کی طرف دھیان نہیں کیا یا پھر شاید وہ لوگ دھیان کرتے ہی نہیں

چاہتے تھے۔ وہ بھی وہیں بیٹھا تھا۔ سب سے باتیں کرتے، کھانا کھاتے ہوئے۔ بی بی وظیفہ کر رہی تھیں اور وہ رات کا کھانا نہیں کھاتی تھیں۔ یہ اسے عاصمہ نے بتایا تھا۔

اس نے بمشکل دو تین نوالے حلق میں ڈالے اور اٹھ گئی۔ کمرے سے نکلتے نکلتے اس نے موہوم سی امید سے اسفند کی طرف دیکھا۔ شاید وہ اس کے اتنی جلدی اٹھ جانے پر چونکا ہو، لیکن وہ اسی طرح بیٹھا تھا۔ دوسروں کی طرح غالباً" وہ بھی اسے نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

"کیوں آخر کیوں؟" اپنے کمرے میں آکر بہت دیر تک وہ تر چہرے اور خشک حلق کے ساتھ بیٹھی سوچتی رہی۔

"یہ سب مجھ سے اتنے گریزاں کیوں ہیں؟ اگر میں ان کو پسند نہیں تھی تو زبردستی کس بات کی تھی اور ان سب کو چھوڑو "اسفند کو کیا مجبوری تھی؟"

تقریباً" بارہ بجے وہ کمرے میں آیا تھا۔ لائٹ آن تھی۔ وہ خاموشی سے آکر لیٹ گیا اور غالباً" فوراً" ہی سو بھی گیا تھا۔

"زارا کے افسانوں میں یوں تو نہیں ہوتا تھا۔" اس کی آنکھوں میں سامنے وہ تمام رسالے گھوم گئے جن کے افسانے زارا پڑھا کرتی تھی۔ اگر یہ مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مجبور تھا تو یہ ہی بتا دے۔ اتنا خاموش کیوں رہتا ہے۔ زارا کے افسانوں میں مجبوری تو بتا ہی دی جاتی تھی اور پھر کوئی حل بھی نکل ہی آتا تھا۔ یہ شخص میرے سامنے آتے ہی بے جان بت کیوں بن جاتا ہے؟ اس کے سوالوں کا اس کے اپنے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ کوئی جواب ہو بھی کیسے سکتا تھا۔

☼ ☼ ☼

بہت پہلے ایک بار اسے وہم سا ہوا تھا کہ امی اس کے کام ہمیشہ عجلت میں کرتی ہیں۔ جب اسے اسکول میں داخلہ لینا تھا۔ انہی دنوں جاوید سخت بیمار پڑ گیا۔ اچھے اسکولوں کے داخلے کی تاریخیں نکل گئیں۔ جلدی میں اسے محلے کے ہی ہائی اسکول میں داخل کروا دیا گیا۔ اس کے اور زارا کے کورسز مختلف ہو گئے لیکن اس نے کبھی اس بات کو اہمیت نہیں دی۔

پھر وہ اسی اسکول میں سیٹ ہو گئی۔ کسی کو خیال نہیں آیا کہ اب ہی اسے کسی اچھے اسکول میں لے جایا جائے۔ کالج میں داخلے کے وقت اس کے مضامین کا مسئلہ تھا۔ زارا نے نانی ماموں کے مشورے کے مطابق سبجیکٹس کا چناؤ کیا تھا۔ اس کی بار نانی ماموں نے نہ تو کسی خط کا جواب دیا نہ ہی خود آئے۔ ابا نے بہت سوچ بچار کے بعد کہا۔

"میری تو سمجھ میں نہیں آتا۔" بہت دن اسی سوچ بچار میں گزر جانے کے بعد امی نے کہا۔

"بس جو تمہاری مرضی ہے، وہی لے لو۔"

داخلے کی تاریخ پھر نکل رہی تھی۔ اس نے جلدی میں فارم پر وہی مضمون لکھ دیے جو زارا نے لیے تھے۔ نانی ماموں کو جب معلوم ہوا تو سخت برہم ہوئے۔

"سارا! تمہارا تو رجحان ادھر تھا ہی نہیں۔"

لیکن وقت گزر چکا تھا۔ اسی طرح سجاد بھائی کی شادی کی تیاریاں جب زور و شور سے جاری تھیں۔ وہ بیمار پڑ گئی۔ زارا اپنی مرضی سے اپنے لیے کپڑے بناتی رہی۔ شادی سے ایک ہفتہ پہلے امی کو فرصت کے لمحوں میں خیال آیا کہ بیمار سہی کپڑے تو وہ بھی نئے ہی پہنے گی۔ وہ اسی عجلت میں جا کر اس کے لیے کپڑے خرید لائیں اور مار امار سلائی کروائی گئی۔

سوچنے بیٹھتی تو ایسی کئی باتیں اسے یاد آجاتیں لیکن اس سے پہلے اس نے کبھی پروا نہیں کی تھی لیکن جب سے وہ اس نئے گھر اور اس کے مکینوں سے متعارف ہوئی تھی۔ برسوں پرانا وہم یقین میں بدلنے لگا تھا۔

بی بی کے چلے جانے کے بعد کئی عقدے آہستہ آہستہ اس پر کھلنے لگے۔ وہ بی بی کی پسند اور انہی کی ضد تھی۔ اسفند کی امی جنہیں سب آپا کہتے تھے کو بی بی کی ضد سے ضد تھی۔ نہ وہ اس کو بہو تسلیم کرنے پر تیار

تھیں۔ نہ ہی گھر میں کوئی جگہ دینے پر رضامند۔ ان کے اس رویے اور سوچ کا اثر باقی سارے گھر پر بھی تھا۔ سب سے بڑے اکرم بھائی بی بی کے ساتھ ہی گئے تھے۔ وہ بھی ابوظہبی میں ہوتے تھے۔ اسد بھائی مستقل واپس چلے آئے تھے۔ اب ان کا ارادہ یہیں پر بزنس شروع کرنے کا تھا۔

آپا کا حکم سارے گھر پر چلتا تھا۔ اور آپا کے حکم کو شمیم باجی کنٹرول کرتی تھیں۔ ان کے میاں کی الیکٹرک گڈز کی دکان تھی۔ وہ خود رنگ محل میں رہتی تھیں۔ لیکن رنگ محل میں رہتے ہوئے بھی وہ اپنے میکے کے سارے معاملات ہینڈل کیا کرتی تھیں۔ بڑی بھابی اور ذری، آپا اور باجی شمیم کی اپنی پسند تھیں۔ اس لیے ان پر ان کا خاص دست شفقت رہتا تھا۔

اسفند جب چھوٹا تھا آپا اپنے میاں کی وفات کی وجہ سے بیمار پڑ گئیں۔ اسفند کو بی بی نے اسی لیے پالنے کی ذمے داری لے لی تھی۔ عاصمہ، اسفند کے والد کی وفات کے دو ماہ بعد پیدا ہوئی تھی۔ آپا پر اس کا بوجھ تھا۔ اسی لیے اسفند بی بی کے پاس رہا۔ بی بی نے اسے اپنے خرچے پر پڑھایا لکھایا تھا۔ اسی لیے اس کے لیے بیوی کا انتخاب بھی انہوں نے اپنا حق سمجھ کر کیا تھا۔ اور یہی بات آپا کو کھلتی تھی۔ یہ ساری معلومات اسے عاصمہ نے فراہم کی تھیں۔ پورے گھر میں سے صرف وہی تھی، جو سارا سے بھی کبھار باتیں کر لیا کرتی تھی۔

اسے بی بی پر اس بات کا افسوس تھا کہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی وہ اس میدان کارزار میں اسے تنہا چھوڑ گئی تھیں۔ خود سے باقی سارے گھر کے اجتناب کی وجہ تو اس کی سمجھ میں آگئی تھی لیکن اسفند اس سے کیوں بچتا پھرتا تھا۔ یہ اس کی سمجھ میں نہیں آپا رہا تھا۔ پہلے دن کے بعد سے اب تک اس کی مسلسل خاموشی بہت ہی مجبوری کی حالت میں ٹوٹتی جب کسی رشتے دار یا اس کے اپنے گھر والوں کے سامنے اسے اس سے کوئی بات کرنا پڑتی۔

وہ شادی شدہ زندگی کے معاملات اور تقاضوں سے نابلد نہیں تھی لیکن اسفند کے رویے پر آہستہ آہستہ صبر کرنے پر مجبور ہوتی گئی۔ دو تین بار اس نے خود اس سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن اسے ایسا لگا جیسے اس سے وہ چوکنا ہو گیا ہو۔ وہ اول تو کمرے میں رات پڑے ہی آتا۔ اور کبھی جو پہلے آجاتا تو اپنے سامنے رکھے بڑے سے بورڈ پر چپکے کاغذ پر پنسل اور مختلف شکلوں کے ٹولز سے آڑی ترچھی لائنیں لگاتا رہتا۔ عمارتوں کے نقشے تیار کرتا رہتا اور اتنی نا سمجھ تو وہ ہرگز نہیں تھی۔ ایسے وقت میں اسے ڈسٹرب کرتی۔

"بہت ممکن ہے کہ میں اس کے کسی ذاتی معاملے کی ناکامی کی وجہ ہوں۔" اس نے سوچ سوچ کر شل ہوتے ہوئے ذہن کو مطمئن کرنا چاہا لیکن عاصمہ نے اس کی اس غلط فہمی کو بھی دور کر دیا۔

"اسفند بھائی کو ایک لڑکی بہت اچھی لگتی تھی۔ عظمیٰ اس کا نام تھا۔ ہمارے ملنے والے ہیں، ان کی بیٹی تھی۔ بی بی رشتہ لے کر گئیں، پر انہوں نے نہیں دیا۔ وہ کہتے تھے ہم برادری سے باہر رشتے نہیں کرتے۔ اسفند بھائی کہنے لگے۔ چھوڑیں بی بی دفع کریں۔" اس نے بتایا تھا۔

"تو اس ذاتی معاملے میں ناکامی کی وجہ میں تو کبھی بھی نہیں ہو سکتی۔" اس نے حیرت سے سوچا۔ "پھر کیا وجہ ہے آخر؟ کیا وجہ ہے؟"

اسے کوئی کلیو نہیں مل رہا تھا۔ وہ اس سوال کے جواب کو وقت کے دھارے پر چھوڑ دیتی۔ اگر باقی گھر والوں کا رویہ کسی طریقے سے بھی مثبت ہوتا۔ اس نے خود سے پہل کرنا چاہی اپنے کمرے کے علاوہ گھر میں موجود دیگر کمروں میں جھانکنا چاہا۔

ان لوگوں کا معمول عجیب تھا۔ اسد بھائی اور اسفند کے چلے جانے کے بعد سب اس معمول میں مصروف ہو جاتے۔ آپا تو صبح ہی چادر سر پر ڈال کر پہلے محلے والوں سے ملنے ملانے اور پھر اپنی منھ بولی خالہ رشیدہ سے ملنے چلی جاتیں۔ بڑی بھابی مار امار کھانا بنا کر ذری کے کمرے میں جا بیٹھتیں جہاں وہ دونوں سارا دن وی سی آر اور کیبل دیکھتی رہتیں۔ بڑی بھابی کے بچے سارے گھر

میں قیامت مچاتے، روتے، پیٹتے، چلاتے رہتے انہیں کوئی پروا نہیں ہوتی تھی۔

عاصمہ صبح کالج جاتی تو دوپہر کے قریب واپس آتی۔ اس نے چاہا کہ وہ ایک بار گھر کی اچھی طرح صفائی ہی کرے۔ چھت سے فرش تک لٹکتے جالوں، دروازوں، کھڑکیوں، چیزوں پر پڑی منوں من دھول جھاڑ دینے کو کئی بار اس کا دل مچلا۔ برتن دھونے والی جھٹ پٹ برتن بھگتا کر اور صفائی والی منٹوں میں سارے گھر کی صفائی کر کے اپنی راہ لیتیں۔ کوئی ان سے یہ نہیں پوچھتا تھا کہ وہ کیا کر کے جاتی ہیں۔ اس نے اپنی خواہش کے پہلے مرحلے میں جب جھاڑن پکڑ کر صفائی شروع کی، اسی وقت باجی تہمینہ گھر میں داخل ہوئیں۔

"ہائے! کیسے کیسے لوگوں کا راج ہو گیا گھر میں؟" انہوں نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ آپا نے جھاڑن اس کے ہاتھ سے تقریباً چھین لیا۔

"رہنے دو بی بی! ہم خود کر لیں گے۔"

اس نے لان میں بکھرے ڈھیروں پتے دیکھ کر صفائی والی سے کہا کہ ان کو روزانہ صاف کر جایا کرے۔ وہ بھی شاید گھر والوں کے اصول جانتی تھی۔ فوراً آپا کے پاس پہنچی۔

"اتنی تنخواہ میں روزانہ کون باہر کی صفائی کرتا ہے۔" آپا اس کے سر پر پہنچ گئیں۔ "اپنی صفائی دھلائی اپنے پاس رہنے دو، ہمارے نوکر نہ بھگاؤ۔"

اپنے باتھ روم کی چپچپاہٹ دور کرنے کے لیے اس نے صفائی والی سے ہی تیزاب کی بوتل منگائی۔ آدھا دن باتھ روم کی صفائی میں گزارنے کے بعد اس نے کمر سیدھی کی۔ باتھ روم کی شکل نکل آئی تھی۔ اور وہ جگمگا رہا تھا۔

آفس سے آنے کے بعد جب اسفند نے باتھ روم کا دروازہ کھولا تو سارا نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں چمک دیکھی۔ اس کا چہرہ فتح مندانہ تاثر لینے لگا لیکن اسی وقت آپا سر پر پہنچ گئیں۔

"ہائے ہائے اسفند! دیکھ تو سہی اس نے سارا گھر تیزاب کی بدبو سے بھر دیا۔ تو یہاں کہاں رہے گا چل میرے کمرے میں، گھر کے باقی غسل خانے غرق ہو گئے ہیں کیا؟"

اور وہ خاموشی سے ان کے پیچھے نکل گیا۔ زری نے پہلی بار باورچی خانے میں جانے پر کڑھی بنائی۔ سارا کے لیے اس گھر کے کھانے کا مزہ تو پہلے ہی نیا تھا لیکن زری کی بنائی کڑھی کی جو شکل تھی۔ وہ بالکل ہی اجنبی تھی۔ تھوڑی سی دہی میں ڈھیر سارا بیسن جس میں پتھر جیسے پکوڑے دھنسے ہوئے تھے۔ آپا نہ صرف کھا رہی تھیں بلکہ ساتھ ساتھ تعریفیں بھی کر رہی تھیں۔ باقی سب کے چہروں سے بھی یہ قطعی ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ کھانا بدمزہ ہے سب خاموشی سے کھا رہے تھے۔

"زری کے ہاتھ کا کھانا تو کھا لیا۔ اب سارا کب کھلائے گی؟" اسد بھائی نے ہاتھ دھوتے ہوئے خوشدلی سے کہا۔

آپا اور بڑی بھابی نے ان کو یوں گھورا گویا انہوں نے کوئی جرم کیا ہو لیکن اس کو تو جیسے یہ نادر موقع ملا تھا۔ خود کو ان میں شامل کرنے کا۔ وہ تیسرے دن ہی موقع پا کر کچن میں گھس گئی۔

"لائیں، میں کھانا پکاؤں بھابی!" اس نے آہستہ سے کہا۔

وہ اسے آزمانا چاہتی تھیں یا واقعی انہوں نے لمحہ بھر کو دل بڑا کر لیا تھا۔ فوراً ہی پیچھے ہٹ گئیں۔ کچن کا حال بھی باتھ روم کا سا ہی تھا۔ ٹائلز اور کوکنگ رینج چکناہٹ سے بھرے ہوئے تھے۔ سنک کا بھی یہی حال تھا لیکن یہ صفائی کا موقع نہیں تھا۔ وہ چپکے سے کھانا بنانے میں مشغول رہی۔ وہ آج بھی کڑھی ہی بنانے لگی تھی۔

اپنے گھر میں اس نے فرض کر کے کھانا کبھی نہیں پکایا تھا لیکن ہر سالن کے بارے میں اسے خاصی شد بد تھی۔ امی کبھی کبھار ان لوگوں سے کھانا پکوایا کرتی تھیں تاکہ انہیں سب کچھ آ جائے۔ اس کے اپنے گھر میں کڑھی بہت اہتمام سے پکائی جاتی تھی۔ سارے کیبنٹس کی تلاشی کے بعد اسے مطلوبہ چیزیں مل ہی گئیں۔ اس نے اتنے ہی اہتمام سے کھانا بنایا۔

اسے یقین تھا کہ اس کی ساری مہارت کام آ گئی ہے۔ بھابی اور زری نے کچن کو اس کے حال پر چھوڑے رکھا۔ سب کے آنے پر اس نے کھانا میز پر چن دیا۔ آج میز کی ترتیب بھی درست تھی اور برتن بھی صاف تھے۔ آپا، کی شفٹ سے واپسی پر خالہ رضیہ کو بھی لے آئی تھیں۔ اس کے کان تبصرے سننے کو تیار تھے۔

"ویسے جی! آج سارا نے بھی ہاتھ ڈال ہی دیا۔" زری نے بآوازِ بلند اعلان کیا۔

"آخ تھو!" سب سے پہلا ری ایکشن خالہ رضیہ کی جانب سے ہوا۔ "لگتا ہے پورا ڈبہ مرچوں کا جھونک ڈالا۔"

"یہ تو دیکھو۔" آپا نے نہایت حقارت سے بگھار میں ڈالی ثابت مرچیں چمچ سے ہلائیں۔ "کوئی طریقہ بھی ہو، اندر بھی مرچیں، اوپر بھی ہائے ہائے رضیہ کا تو بلڈ پریشر ہائی ہو جائے گا۔"

ان کے ری ایکشنز کچھ ایسے اثر انگیز تھے کہ رفتہ رفتہ سب نے ہاتھ کھینچ لیا۔ اس نے بڑے تحمل سے سارا ڈرامہ دیکھا اور ان سب کے اٹھنے کے بعد برتن سمیٹ کر کچن میں لا رکھے۔

"شام کو لے جانا رضیہ! اپنے ساتھ، بانٹ دینا لوگوں، ماسیوں میں۔" کچن سے آپا کی آواز سنائی دی۔

"کچھ نہیں، کچھ نہیں ہو سکتا۔" اپنے کمرے میں آنے کے بعد اس کا سارا ضبط جواب دے گیا۔

اب تک اس نے بڑے صبر سے سب کچھ برداشت کیا تھا۔ اسے نہ نفرتوں کا تجربہ تھا، نہ بے اعتنائی کا۔ اسے نہ خوشامد کرنا آتی تھی، نہ زبردستی۔ اب تک اس نے کبھی کچھ دل میں رکھا تھا نہ چھپایا تھا۔ شادی کے دن سے لے کر اب تک وہ ان سب تجربات سے اکیلی گزرتی آئی تھی۔ اس کے ساتھ اس کے سسرال والوں کا کیا رویہ تھا۔ اس نے امی ابا تک سے ذکر نہیں کیا تھا۔

اسفند اس سے بات تک کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ اس بات کی ہوا اس نے اس گھر میں موجود لوگوں تک کو نہیں لگنے دی تھی۔ حالات کو تھوڑا بہت سمجھنے کے بعد سے اب تک اس نے خوشامد سے، خوش دلی سے اس گھر کے لوگوں کا دل جیتنے کی پوری کوشش کی تھی لیکن وہ اپنے موقف اور اصول کے پکے تھے۔ وہ اسے پہلے دن سے مسترد کر چکے تھے۔ آج تک اپنی بات پر ڈٹے ہوئے تھے۔

* * *

ہر بار وہ اپنے گھر یہ سوچ کر جاتی کہ اب تو امی سے ضرور بات کروں گی لیکن خاموش واپس آ جاتی۔ وہ امی کے مردم شناس ہونے کے دعوے کو غلط ثابت نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسے حیرت ہوئی کہ کوئی اسے خاموش اور سنجیدہ دیکھ کر یہ اندازہ کیوں نہیں لگاتا کہ اسے کوئی تکلیف ہے۔ وہ سب اس خیال میں کیوں مبتلا ہیں کہ وہ زارا کی طرح خوش باش ہے۔ اسے معلوم تھا کہ جب بھی اس کے میکے سے کوئی آتا، آپا اس کے سامنے سراسر بدل جاتی تھیں۔ اس کی، اس کے سگھڑاپے کی بے تکان تعریفیں کرتی تھیں۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ ایسا کیوں کرتی ہیں؟

اسفند آگے پیچھے خاموش رہتا ہے۔ تو ان کے سامنے کیوں باتیں کرنے لگتا ہے، جیسے کسی نے اس میں چابی بھر دی ہو۔ وہ کس کا گلہ، کس کی شکایت، کیسے کر سکتی تھی جبکہ امی کی نظر میں وہ سب فرشتے تھے۔ جتنا وہ بدل چکی تھی۔ اس کا اسے خود بھی یقین نہیں آتا تھا لیکن اس کی تبدیلی کسی اور کو نظر کیوں نہیں آتی۔

بی بی کا فون آنے پر سب سے پہلے اس کی ان سے بات کرائی جاتی۔ وہ ان کو سب اچھا ہے کی رپورٹ سناتی اس کے سر پر کھڑی آپا کی نظریں گویا یہ کہہ رہی ہوتیں کہ خبردار کچھ نہ بتانا۔ رفتہ رفتہ وہ ان سب سے خوف محسوس کرنے لگی۔ وہ بزدل نہیں تھی لیکن ان کی نظریں، ان کی باتیں، ان کے رویے اسے کمرے سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ کبھی کبھار زارا آ جاتی تو اسے محسوس ہوتا کہ سکون کے چند لمحے اس کی زندگی میں آ گئے۔ زارا اور نوید ایک مہینہ کلفٹن

اور سوات گزار کر آئے تھے۔ زارا کی صحت بہت اچھی ہو رہی تھی۔

"تمہیں کیا ہوا ہے؟ اتنی پیلی ہو رہی ہو؟"

زارا چونک کر کہتی لیکن دوسرے ہی لمحے میں وہ اپنا کوئی قصہ سنانے لگتی۔ اس کی اپنی ساس کے ساتھ اچھی خاصی دوستی تھی۔ نوید کو محلے کی طرف سے گھر ملا ہوا تھا۔ زارا کا وہ سرا ٹارگٹ اس کو سجانا اور سنوارنا تھا۔

"تم چلو نا میرے ساتھ بازار۔" وہ کئی بار کہتی۔

اس کو کمرے سے باہر نکلنے سے خوف آتا تھا کہاں گھر سے باہر نکلنا۔ لیکن وہ دو تین بار زبردستی اسے اپنے ساتھ لے گئی۔ اسے بہت جلد ہر راستے کا علم ہو گیا تھا۔ بکنوں کے نمبر، بازاروں کے راستے، دکانوں کے نمبر۔ وہ کبھی نوید اور کبھی اپنی ساس کے ساتھ بازار کے چکر اکثر لگاتی۔

بازار میں وہ مختلف چیزیں ڈھونڈتی رہتی۔ کمرے کے رنگ سے میچنگ پردے، صوفہ بیک، ٹرالی کورز، فلور کشنز، ڈیکوریشن پیسز اس کی ہر خریداری پر سارا کے اندر ایک نیا احساس محرومی اٹھ آتا۔ کئی بار اس کا دل کئی چیزیں لینے کو چاہتا لیکن اس کا خالی پرس اور یہ خیال کہ اس کا وہ کیا کرے گی۔ اس کو اپنی خواہش اندر دبا لینے پر مجبور کر دیتا۔ زارا کے بہت اصرار پر وہ اس کے گھر بھی چلی آتی۔ وہ اس سے مختلف چیزوں کے لیے ٹھکانے پوچھتی۔

"یہ یہاں اچھا لگے گا وہ وہاں۔" زارا کے گھر آ کر اسے ایک اور طرح کا احساس کاٹنے کو دوڑتا۔

زارا نوید کے مختلف کام کرتی۔ اس کی چیزیں ترتیب سے رکھتی۔ اس کے کپڑوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتی۔ کہیں کوئی سیون کہیں کوئی بٹن تو نہیں رہ گیا۔ نوید کے آنے کے بعد یہ خیال وہ چند ہو جاتا۔ اس کا دل مچلنے لگتا۔ کاش اسفند کبھی تو اس لہجے میں اس سے بات کرے۔ اسفند نے اس لہجے میں تو کجا اس سے بات ہی نہ کرنے کی قسم کھا رکھی تھی۔

"تم نے کمرے میں کیا ٹھونسا ٹھونسی لگا رکھی ہے۔ کوئی ترتیب تو ہو جو کچھ ہے یہاں ہی گھسا رکھا ہے۔" زارا اس کے کمرے میں آتی تو کہتی۔

"اسفند تمہیں کہتا نہیں کہ ذرا سانس لینے کو جگہ خالی کرو۔"

"نہیں، وہ کہتے ہیں۔ ابھی ایسے ہی ٹھیک ہے، پھر دیکھا جائے گا۔"

وہ چونک کر جواب دیتی۔ وہ زارا کے سامنے اپنی محرومی کی ایک معمولی سی جھلک بھی ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسفند کا کیا تھا۔ وہ تو شروع سے ہی نہ حل ہونے والے معمے اور نا قابل جواب سوال کی طرح اس کے سامنے موجود رہتا تھا۔ اسے یاد تھا کہ بی بی نے جانے سے پہلے کیا کہا تھا کہ۔

"بندہ دل بڑا رکھے تو وہ سچا سرکار بھی فضل کرتا ہے۔"

اس نے اب تک اپنا دل بڑا رکھنے کی بڑی کوشش کی تھی۔ خدا کے حضور سجدے کر کر کے اچھے دن پھر جانے کی دعا کی تھی۔ بری لگنے والی باتوں کو تھوک دیا تھا لیکن اسے کوئی فائدہ ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

گرمیاں دبے پاؤں چلتی بالآخر اپنے پورے جوبن کے ساتھ آموجود ہوئی تھیں۔ اس کے پاس پہننے کو باریک کپڑے نہیں تھے۔ ابھی تک وہ شادی کے کپڑے ہی پہنتی رہی تھی۔ لیکن اب وہ چبھنے لگے تھے۔ گرمیوں میں اسے ہلکے پھلکے وائل، لان کے ہلکے رنگوں والے کپڑے پہننا بہت اچھا لگتا تھا۔ گرمیوں کے آغاز پر وہ بڑے شوق سے نئے کپڑے بناتی تھی۔ شام کو نہا کر نئے کپڑے پہننے اور ٹالکم پاؤڈر کی خوشبو میں اسے ہمیشہ سے ہی بڑا چارم نظر آتا تھا۔ لیکن یہاں پر لوگوں کو شاید ان کپڑوں کی عادت نہیں تھی۔ وہ سب بھرپور گرمی میں بھی شوخ رنگوں کے وہ ریشمی سوٹ پہنتی تھیں جو ابوظہبی سے آئے تھے۔ اس روز زارا صبح ہی آ گئی۔

"آج نوید نے چھٹی لی تھی۔ میں نے سوچا بازار کا چکر لگا آئیں لان کے کپڑے لے آئیں۔ تم بھی چلو۔"

اس نے کہا۔ آپا جو اصرار کر کے زارا اور نوید کو چائے بسکٹ پیش کر رہی تھیں خوش دلی سے بولیں۔

"جاؤ بہن لینے آئی ہے۔"

اسے کیا خریدنا تھا اسے کیا چاہیے تھا اس سے انہیں کوئی سروکار نہیں تھا، وہ تو زارا اور نوید کے سامنے حسن سلوک کے مظاہرے میں مصروف تھیں۔ اس نے آسمانی جارجٹ کا سوٹ پہنا اور دو چار بار کنگھا پھیر کے بال درست کیے۔ اس کا وینٹی باکس شادی کے شروع کے دنوں میں استعمال ہونے کے بعد سے اب تک بند پڑا تھا۔ چند ہی مہینوں میں وہ اپنے ہر شوق، ہر ارمان سے ماورا ہو چکی تھی۔ اس تیاری کے بعد اس نے بغل میں خالی پرس دبایا اور باہر نکل آئی۔

شادی پر ساری سلامیوں کا پرس باجی نعیم نے اس سے پہلی مرتبہ گھر جانے کے وقت ہی لے لیا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کا انہوں نے کیا کیا۔ نہ ہی اس نے پوچھا تھا۔ کہ وہ کہاں ہے۔ ابا یا سجاد، زبیر بھائی کبھی آتے تو اسے پیسے دے جاتے یا گھر سے آتے ہوئے امی اس کی مٹھی میں کچھ پکڑا دیتیں لیکن وہ سب اس کی چھوٹی موٹی ضرورتوں پر خرچ ہو جاتا۔ اس کی بڑی ضرورتیں کسی کا دردسر نہیں تھیں۔ اکثر زارا کے ساتھ وہ یونہی خالی پرس لیے گھومتی رہتی۔

اس روز بھی ایسے ہی ہوا۔ زارا ادھر ادھر خریداری کر رہی تھی۔

"یہ سوٹ میرے لیے، یہ امی کے لیے۔"

وہ ہر دکان پر یہی کہتی۔ نوید جس خوش مزاجی سے بل ادا کرتا۔ زارا کی گردن اکڑانے کے لیے وہی کافی تھا۔

"یہ سلیم لیبو کس سے سارا! تم بھی کوئی سوٹ خرید لو نا۔ ان کے پرنٹس کامن نہیں ہوتے۔" وہ اس سے کہہ رہی تھی۔

خالی کھیا اور بھر آنے والا دل

اسے امی ماموں کے سنائے شعر کا مصرع یاد آ گیا۔

"میں پھر لے لوں گی۔" وہ ہر بار منع کر دیتی۔

"ہائے تم نے کیسے یہ جارجٹ کا سوٹ پہنا ہوا ہے؟" اسے اچانک خیال آیا۔ "نوید! کوئی کولڈ ڈرنک نہ لے لیں۔"

وہ ہمیشہ کی طرح اس کا جواب سنے بغیر دوسری طرف دھیان کر کے بولی۔

"سارا تو لگتا ہے یونہی آگئی تمہارا دل رکھنے کو۔ اصل شاپنگ تو وہ اسفند کے ساتھ آ کر کرے گی۔"

نوید نے ہنستے ہوئے کہا۔ اس نے اپنی نم آنکھیں جھکائے رکھیں۔

ان دونوں کو کسی دوست سے ملنے جانا تھا۔ واپسی پر وہ اسے گیٹ پر ہی اتار کر چلے گئے۔ وہ خالی ہاتھ کمرے میں داخل ہوئی۔ خلاف توقع اور خلاف معمول اسفند اس وقت کمرے میں موجود تھا۔ یہ شاید اس کے گھر میں نہ ہونے کی وجہ سے تھا۔ وہ بیڈ پر لیٹا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ وہ خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے کتاب پر سے نظریں ہٹا کر چند سیکنڈ اس کو دیکھا۔

"تم نے بتایا نہیں کہ تم شاپنگ کے لیے جانا تھا اور میں بھی بھول گیا تھا کہ تم نان و نفقہ سمیت مجھ پر ڈالی گئی تھیں۔"

اس نے اٹھ کر بیڈ سے ٹانگیں لٹکا کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

اتنے عرصے میں یہ پہلا مکمل اور براہ راست جملہ تھا جو اس نے اس سے کہا تھا۔ اس کا دل لرزنے لگا۔ اس نے اس کے جملے پر غور ہی نہیں کیا تھا۔ وہ اس کو بوجھ سمجھتا تھا یا ذمے داری جو اس پر ڈالی گئی تھی۔ وہ خوشی کے ایک انجانے تصور سے اسے دیکھنے لگی۔ اس ایک جملے کے بعد گویا اسے دوبارہ سے وہی چپ لگ گئی۔ کچھ دیر وہ انگلیوں کے جوڑ چٹخاتا رہا اور پھر اٹھ کر سرعت سے باہر نکل گیا۔

وہ اسے جواب دینا چاہتی تھی۔ اس سے کہنا چاہتی تھی کہ اس نے اس سے کچھ پوچھا ہی کب تھا۔ لیکن اس نے موقع ہی نہیں دیا۔ پھر بھی یہ اس کے لیے بہت تھا کہ اس نے اس سے ایک جملہ ہی سہی، کچھ کہا

تو تھا۔ وہ اٹھ کر بستر پر آ بیٹھی۔

اس نے اس کی چھوڑی ہوئی کتاب اٹھائی۔ یہ سول انجینئرنگ کی ہی کوئی کتاب تھی۔ وہ اسی طرح کی کتابیں پڑھتا تھا۔ ٹیکنیکل قسم کی بعض ایسی جن کے نام بھی اس سے نہیں پڑھے جاتے تھے۔ اسی طرح کے جرنلز یا پھر معلوماتی کتابیں۔ آرکیالوجی پر، اسٹرالوجی پر، ہسٹری پر، جب کہ اسے اس طرح کی کتابوں سے سدا کی چڑ تھی۔ وہ ہلکی پھلکی کتابیں پڑھا کرتی تھی۔ نثر کی، شاعری کی۔ یہاں آکر تو وہ سب ہی کچھ بھول گئی تھی۔ زارا کے گھر میں کوئی میگزین پڑھنے لگتی تو اس کا دل بے زار ہو جاتا مگر اسفند کی کتابوں کے ٹائٹل ہی اسے الجھے لگتے تھے۔

ایک کمرے میں رہتے ہوئے بھی سارا کو اسفند اپنی پہنچ سے بہت باہر لگتا۔ آفس سے آکر کھانے کے بعد وہ کتنی دیر بے مقصد ڈرائنگ روم اور ڈائننگ روم کے چکر لگاتا رہتا۔ اسی طرح سارے گھر میں پھرتا پھراتا وہ تین بجاتا اور چابیاں اٹھا کر باہر نکل جاتا۔ شام پڑے واپس آتا۔ خاموشی سے کھانا کھاتا۔ گھر والوں سے باتیں کرتا۔ کمرے میں آکر آڑی ترچھی لائنوں سے کھیلتا یا ان بے ہنگم ناموں والی کتابوں کو پڑھتا رہتا۔

جب سے اس نے محسوس کیا تھا کہ سارا بے ضرر ہے۔ اس کو خاموش دیکھ کر خود بھی خاموش ہو گئی ہے۔ وہ رات کے بارہ نہیں بجاتا تھا۔ نو بجے ہی کمرے میں آجاتا۔ دیر تک پڑھنے کے بعد لائٹ آف کر کے سو جاتا۔

جب سے سارا نے محسوس کیا تھا کہ بستر پر اس کی موجودگی کی وجہ سے ساری رات ایک کروٹ پر ساکت لیٹا رہتا ہے۔ اس نے نیچے سونا شروع کر دیا تھا۔ اس کا اس نے نہ شکریہ ادا کیا تھا نہ ہی یہ کہا تھا کہ وہ ایسا کیوں کرتی ہے۔ البتہ رات کو کروٹ آرام سے بدلنے لگا تھا۔

سارا کو معلوم تھا کہ اگر وہ اس کی رسائی سے باہر ہے تو اپنے گھر والوں کے لیے بھی تقریباً اجنبی ہے۔ اس نے کبھی اس کو ان سے زیادہ باتیں کرتے نہیں دیکھا تھا۔ اس کا کوئی دوست بھی کبھی گھر پر نہیں آتا تھا۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اسفند کا کوئی دوست ہی نہیں نہ گھر میں نہ باہر۔ اسے اس پر ترس آنے لگا تھا۔ کام کرتے ہوئے وہ اکثر اپنی انگلیوں کے جوڑ چٹخاتا جیسے کوئی اندرونی اضطرار اسے بے چین کر رہا ہو۔

اس کے معمولات کو دیکھتے ہوئے سارا نے اسے اپنی فطری نیک دلی کی وجہ سے دل سے معاف کر دیا تھا۔ اس کی طرف سے وہ تقریباً مایوس ہو چکی تھی لیکن آج کے اس کے ایک جملے نے ہی اس کی مردہ ہوتی امید میں جان سی ڈال دی تھی۔

اس نے اٹھ کر بستر کی چادر جھاڑ کر دوبارہ ڈالی۔ اس کے بکھرے کپڑے سمیٹے اور الماری کے راڈ پر ڈال دیے۔ اس سے پہلے اس کی چیزیں سمیٹنے پر اس نے کہا تھا۔

"مجھے اپنا کام خود کرنے کی عادت ہے۔"

جملہ اس نے عاصمہ کی موجودگی میں کہا تھا۔ وہ جان گئی تھی کہ یہ اس سے کہا گیا ہے۔ اس لیے اس کے بعد سے اس نے اس کی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ لیکن آج کے جملے نے اس میں جان جو ڈال دی تھی۔ وہ یہ ایک جملہ کہہ کر پھر سے لاتعلق اور خاموش ہو گیا تھا لیکن کتنی دیر وہ اس سے خوش ہوتی رہی۔

اس سے اگلے دن آفس جانے سے پہلے اس نے اس کے کرسی پر پڑے دوپٹے پر ایک ایک ہزار کے دو نوٹ رکھے تھے۔ اس کو گویا ہفت اقلیم کی دولت مل گئی۔ اس نے ان مقدس کاغذوں کو اٹھا کر اپنے بیگ میں رکھ لیا۔ شاید اس کے صبر کا پھل اسے ملنے ہی والا تھا لیکن دوبارہ سے اس کی خاموشی نے اس کی خوشی کو پھر مردہ کر دیا۔

سجاد بھائی اور بھابھی بہت دنوں کے بعد ان سے ملنے آئے تھے۔

"تم دونوں تو میکے کو بھول ہی گئیں۔" بھابھی نے اس سے کہا۔ آپا اور باجی شمیم ان کی خاطر تواضع میں بری طرح مصروف تھیں۔

"امی کا کیا حال ہے؟ بی بی ہر بار فون پر پوچھتی

ہیں۔" آپا نے سجاد بھائی سے پوچھا۔

"سب ٹھیک ہیں، زارا اور سارا خوش ہیں تو ہم سب ٹھیک ہیں۔" سجاد بھائی کو ایک ہی جملہ آتا تھا۔

اسفند بھی اپنے پرانے تپاک کے ساتھ ان سے ملا تھا۔ امی نے ان دونوں کے لیے دو سوٹ وائل کے سلوا کر بھیجے تھے۔ اس کے اندر جان سی پڑنے لگی۔

"امی نے کہا ہے کہ رمضان سے پہلے ایک چکر لگا جاؤ۔ پھر عید پر آنا۔" بھابی نے سرگوشی کی۔

"اچھا!" اس کا دل ابھی ان کے ساتھ ہی جانے کو چاہ رہا تھا۔ لیکن امی کا کہا ٹال تو نہیں سکتی تھی۔ اس کے پاس سے اٹھ کر وہ لوگ زارا کی طرف گئے۔

اس نے اگلے دن ہی نہا کر امی کا بھیجا جوڑا پہنا۔ ایک دم وہ ہلکی پھلکی ہو گئی تھی۔ پانی پینے کے لیے باہر نکلی۔ رضیہ خالہ صبح سے آئی ہوئی تھیں۔ وہ ان کے پاس آ گئی۔

"دیکھیں کیا حال ہے، یہ کیا کپڑا پہنا ہے؟" انہوں نے چٹکی میں لے کر شلوار مسلی۔

"وائل ہے پچاس روپے میٹر۔ میکے سے آیا ہے جوڑا۔ فٹافٹ چڑھا لیا کم بختی کیسے بھولے۔" آپا آج کہنے والی بات کل پر رکھنے کی قائل نہ تھیں۔

"گرمی ہے نا!" خالہ رضیہ نے طنز سے ہنس کر کہا۔

"آئے ہائے ایسی گرمی بھی کیا ہم سے تو نہیں پہنے جاتے یہ پردے۔"

زری نے اپنی بڑے بڑے پھولوں والی سلک کی قمیص گھٹنوں پر پھیلاتے ہوئے کہا۔ اس کا کچھ دیر پہلے والا خوش باش دل مرجھا گیا۔

بی بی نے کہا تھا۔ "جو برا لگے لے تھوک دینا۔" اب تک تو وہ تھوکتے تھوکتے بھی تھک گئی تھی۔ آپا اس کو براہ راست کچھ نہیں کہتی تھیں۔ آنے جانے والوں کے پاس بیٹھے ہوئے ہی کوئی بات کرتی تھیں۔

"اتنا صابن استعمال کرنا کس کام کا؟ مشین کا کیا فائدہ۔" وہ کپڑے دھو کر باہر پھیلانے آتی تو وہ کہتیں۔

"سارا سرف غسل خانے دھونے پر ہی لگا دیا جاتا ہے یہاں۔" وہ اسے باتھ روم دھوتے دیکھ کر کہتیں۔

"میکے سے چھاج بھر کر لائی تھی نا جیسے بہایا تو یوں جاتا ہے۔ اسفند گھر کے خرچ کو تو ہمیں پھوٹی کوڑی تک نہیں دیتا۔"

"میرا بیٹا تو دھوکے میں مارا گیا۔ دیکھا نہیں، کیسا چپ چپ ہو گیا ہے۔ اسے تو بی بی کی صحت لے ڈوبی۔"

"زری کے میکے والے دیکھے ہیں۔ کیسا منوں من لاد کر بھیجتے ہیں۔ اس کے سارے بھائی شارجہ میں ہوتے ہیں۔ باپ کا اپنا بزنس ہے۔ ایک یہ پسند آئی تھی بی بی کو، ریٹائرڈ افسر کی بیٹی۔"

آج اس کے سوٹ کے بارے میں ان کے تبصرے ختم ہونے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

"اور بی بی کہتی تھیں، معاف کر دینا۔" اس نے روہانسی ہو کر سوچا۔

وہ اپنی سی پوری کوشش کر چکی تھی بلکہ اپنی ہمت سے زیادہ بھاگ دوڑ کی تھی۔ اب اس کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ ناپسندیدگی، نفرت ——— بے اعتنائی اور جذباتی وابستگی کے فقدان کے اس اجنبی ماحول میں اپنے لیے کس طرح گنجائش پیدا کرے۔

☼ ☼ ☼

رمضان کی آمد سے ایک ہفتہ پہلے ہی زری کے چکر اور الٹیاں شروع ہو گئیں۔ آپا اور باجی شمیم کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ زارا ملنے کے لیے آئی اس کا بھی یہی حال تھا۔

"اب تو میں نہیں جا سکتی امی کی طرف۔"

اس نے کہا۔ اسے زارا کے ساتھ ہی جانا تھا۔ وہ نہیں جا رہی تھی تو وہ بھی کیسے جا سکتی تھی۔ زری پہلے بھی کم ہی گھر کا کام کرتی تھی۔ اب تو اس کے نخرے ہی اور تھے۔ سارا دن وہ بستر سے قدم نیچے نہیں رکھتی تھی۔ ناشتا، کھانا، چائے، پھل، جوس، یخنی سب کچھ وہیں پہنچایا جاتا تھا۔ زری کی امی پچھلے کئی دن سے ادھر ہی تھیں۔ آپا کی ملنے جلنے والیاں آپا کو مبارک دینے آ رہی تھیں۔

"کھٹی شادی ہوئی تھی۔ دوسری کا کیا حال ہے؟" کسی نے آپا سے پوچھا۔
"چھوٹو بہن ادھر تو عنوان بھی نظر نہیں آرہے۔" آپا کے لہجے میں ہمیشہ والی کاٹ تھی۔ وہ تقریباً زمین میں گڑ ہی گئی۔
اس کا کوئی قصور اس بات میں بھی نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ابھی تو کیا کبھی بھی عنوان نظر نہیں آئیں گے۔ لیکن پھر بھی وہ سب سے چھپی چھپی پھر رہی تھی۔ گھر میں ان دنوں اسی بات کا چرچا تھا۔ خالہ رضیہ کو کھلی بات کرنے کی عادت تھی۔ ایک روز اسفند کو بٹھا کر با آواز بلند انہوں نے کہا تھا۔
"تمہاری بیوی کب خوشخبری سنا رہی ہے اسفند؟" وہ سرخ چہرہ لیے اٹھ گیا تھا۔
سارا کو اندازہ نہیں ہوسکا کہ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہوا تھا یا شرم سے۔ رمضان میں زری نے جو روزے نہیں رکھنے تھے' وہ ایک الگ بات تھی۔ آپا اور بڑی بھابی نے نجانے کس وجہ سے روزے نہیں رکھنے تھے۔ اسد بھائی کو صبح سے شام تک کام کرنا ہوتا تھا۔ وہ روزہ کیسے برداشت کرسکتے تھے۔ یہ آپا نے کہا تھا۔ وہ ہی بچی تھی۔
اس کے لیے اپنے گھر میں رمضان کا بھی خاص اہتمام ہوتا تھا۔ امی جان بوجھ کر روزہ نہ رکھنے والے سے سخت ناراض ہوا کرتی تھیں۔ اسے بچپن سے روزہ رکھنے کی عادت تھی۔ پہلی سحری کو وہ بہت ہمت کرکے اٹھی۔ اور کچن میں جا کر اپنے لیے سحری بنانے لگی۔ کڑھی بنانے والے دن کے بعد اس نے کچن میں قدم نہیں رکھا تھا۔ وہ اپنے کام میں مگن تھی۔ جب اس نے اپنے پیچھے قدموں کی آواز سنی۔
"میں پھلکا کھاتا ہوں دہی کے ساتھ۔" مختصر الفاظ ادا کرکے وہ میز پر جا کر بیٹھ گیا۔ اس نے جھٹ پٹ پھلکا اتارا۔ اور فریج میں سے دہی نکال کر اس کے سامنے رکھا۔
خاص اس کے لیے کام کرتے ہوئے اس میں ایک عجیب سی پھرتی آگئی۔ منٹوں میں اس نے چائے بنائی اور خود بھی آبیٹھی۔ وہ خاموشی سے سر جھکائے چھوٹے چھوٹے نوالے حلق سے اتارتا رہا۔
"مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ بھی روزہ رکھتے ہیں۔" پہلی بار اس نے دوستانہ انداز میں کہا۔
"ہوں!" اسے جیسے کرنٹ لگا تھا۔ باقی کا پھلکا سیکنڈوں میں ختم کرکے وہ پانی کا گلاس اور چائے کا مگ اٹھائے باہر نکل گیا۔
"کاش میں کچھ نہ کہتی۔ کاش میں محض دیکھتی رہتی۔" منٹوں میں بدلتی سچویشن اسے عجیب غم لگا گئی۔ پھر یہ روز کا معمول بن گیا۔ مقررہ وقت پر وہ سحری کے لیے آتا اور فارغ ہوکر چلا جاتا۔ پہلے دن کی غلطی اس نے دوبارہ نہیں دہرائی۔
زارا نے ان دونوں کو اپنے ہاں افطار پر بلایا تھا۔ نوید کا فون اسفند نے ریسیو کیا تھا۔ عادت کے خلاف دوسرے روز وہ تین بجے گھر سے بھاگا نہیں تھا۔
"اسفند بھائی نے پوچھا ہے' آپ تیار ہوگئیں بھابی؟"
عاصمہ نے آکر کہا۔
وہ حیران تھی یہ اسفند نے پوچھا تھا۔ فٹافٹ اٹھ کر وہ منٹوں میں تیار ہوئی۔ اس کے ساتھ اکیلے کہیں جانے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ اسے اپنے گھر سے زارا کے گھر کا راستہ بہت مختصر لگا۔ زارا کے ہاں آپی اور مانی ماموں بھی موجود تھے۔
"آپ۔۔۔ آپ نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟" وہ تقریباً چلائی تھی۔
"تمہیں ہم سرپرائز دینا چاہتے تھے۔" مانی ماموں نے اسے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔
"ہم آج ہی پہنچے ہیں' پہلے ادھر آگئے۔ معلوم ہوا کہ یہاں افطار پارٹی ہے۔ سوچا تم کو سرپرائز دے دیں۔" آپی نے کہا تھا۔
اس کی شادی کے بعد آپی پہلی مرتبہ پنجاب آئی تھیں۔ مانی ماموں بھی امی ہی کی طرح دو تین بار آئے تھے۔ اس سے مل نہیں پائے تھے۔ بہت دنوں کے بعد اس نے خود میں مسرت کی لہر محسوس کی۔ بٹو اور ٹیپو

خوش تھے کہ زارا اور سارا خالہ اتنے دنوں بعد ملی تھیں اور ایک جگہ اکٹھی تھیں۔
"تم آج یہاں ہی رہ جاؤ۔ ہم بھی صبح سیالکوٹ جائیں گے۔" آپی نے اس سے کہا۔
وہ اس کے گھر نہیں جا رہے تھے۔ وہ وہاں رہ بھی کہاں سکتے تھے۔ اس کا دل بھی یہیں رہنے کو چاہنے لگا۔ لیکن اسے معلوم تھا کہ اسفند کو سحری کے وقت مشکل پڑ سکتی ہے۔ پہلے بی بی اس کے لیے سحری بناتی تھیں اور اب وہ۔۔۔ یہ عاصمہ نے اسے بتایا تھا۔ وہ کچھ تذبذب میں پڑ گئی۔
"اگر سارا کو آج یہاں ہی چھوڑ جاؤ تو۔" مانی ماموں اسفند سے کہہ رہے تھے۔
"ٹھیک ہے رہ جائے۔" وہی مختصر جواب۔
"لیکن وہ۔۔۔" وہ سحری کے بارے میں کہنا چاہتی تھی۔ نجانے وہ کیسے سمجھ گیا تھا۔
"ہوجائے گا۔" یہ مختصر جملہ اس نے آہستہ آواز میں کہا تھا لیکن اس نے سن لیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد وہ زارا کے لاؤنج میں بیٹھ گئے۔
"سارا! تم نے چیک اپ نہیں کرایا میں نے سنا ہے کہ تمہاری جٹھانی بھی۔۔۔" آپی نے اس سے کہا کئی دنوں سے وہ یہ تذکرہ سن سن کر تھک گئی تھی۔
وہ کوئی نئی بات کرنا چاہتی تھی۔ نئی فضا میں سانس لینا چاہتی تھی۔ اس نے بے زاری سے منہ پھیر لیا۔
"اچھا ہوجائے گا۔ کبھی دیر ہو بھی جاتی ہے مگر پہلی بار میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔" آپی کے لہجے میں تشویش بھی تھی اور تسلی بھی۔
اس کا دل ان کے سامنے سے بھاگ جانے کو چاہنے لگا۔ زارا کا دل ایک دم گھبرانے لگا۔ وہ اس وقت باہر گھومنے جایا کرتی تھی۔ نوید فوراً اٹھ گیا۔
"ابھی چلو۔" اس نے ان سب کو چلنے کو کہا۔ آپی …ا اور ٹیپو کے ساتھ ان کے ساتھ تیار ہو گئیں۔ "تم جاؤ …ال! ہم تو سارا سے باتیں کریں گے۔" مانی ماموں نے … ساتھ اسے بھی بٹھا لیا۔
"کیا بات ہے سارا بی بی! تم کچھ بجھی بجھی سی معلوم ہوتی ہو۔"
شادی سے پہلے وہ منتظر ہوتی تھی کہ اس کے مسئلے مانی ماموں پوچھیں اور وہ ایک ایک کر کے ان کو بتاتی جائے۔ لیکن اب وہ اس لہجے کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ کسی کو یہ نہیں بتانا چاہتی تھی کہ وہ کہاں کہاں لڑی ہے اور کہاں کہاں اس نے شکست کھائی ہے۔
"کچھ نہیں' ایسے ہی۔"
"لگتا ہے کہ بات کچھ بنی نہیں۔" مانی ماموں اس کو اندر تک جان لیتے تھے۔ وہ پرت در پرت پڑھ لینے کے ماہر تھے۔
"آپ کا وہم ہے۔"
"عادتیں مختلف ہیں نا تمہاری اور تمہارے سسرال والوں کی۔"
"آپ کو کیسے پتا ہے؟" اس نے حیرت سے ان کو دیکھا۔
"مجھے سب پتا ہوتا ہے سارا! یہ تو تمہیں بھی علم ہے۔" وہ خاموش رہی۔
"بعض دفعہ اس میں کوئی حرج نہیں ہوتا کہ بندہ دوسروں کے حسب منشا سوچے اور جیے۔ میرا خیال نہیں کہ اس سے زیادہ آسان کام بھی کوئی ہے۔" مانی ماموں نے زارا کی ساس کے قدموں کی آہٹ سن کر اٹھتے ہوئے کہا۔

☼ ☼ ☼

اگلے روز جمعہ تھا۔ آپی نے صبح سے ہی سیالکوٹ جانے کی تیاری کرنا شروع کردی تھی لیکن ایک ہی دن میں ان کا سامان بکھر سا گیا تھا۔
"چھوٹی خالہ کراچی گئی تھیں علی کے لیے لڑکی دیکھنے' میرے پاس ہی ٹھہری تھیں۔" آپی کی زبان زور شور سے چل رہی تھی۔
"اور تمہاری شادی پر رخصتی کے بعد کیسا فس مچایا تھا۔ انہوں نے کہ سارا کا رشتہ کیوں باہر دیا۔ انتظار تک نہ کیا۔ کہتی تھیں علی کہتا ہے خالہ نے بڑی جلدی کی اب مجھے کہیں اور شادی نہیں کرنی۔ میرے بیٹے کی

خواہش تباہ کردی۔ اب دیکھو کیسے فٹافٹ رشتے ڈھونڈے جارہے ہیں۔" آپی بات کرتے کرتے باہر نکل گئیں۔

وہ چونک سی گئی۔ علی بھائی کو یہ کہتے تو اس نے بھی سنا تھا کہ خالہ نے بڑی جلدی کی سارا کی شادی کے سلسلے میں' اس وقت تو وہ دل ہی دل میں ان کی ممنون ہوگئی تھی۔ شکر ہے مانی ماموں کے علاوہ کسی اور کو بھی اس بات کا خیال آیا۔ لیکن اسے یہ تو ہرگز علم نہیں تھا کہ علی بھائی نے یہ اس لیے کہا تھا۔

"کیا کہہ رہی تھیں آپی؟" زارا پاؤں کے ناخنوں پر نیل پالش لگاتے ہوئے اچانک چونکی۔

"تم کیا سوچ رہی ہو؟" اس کی خاموشی پر اس نے دوسرا سوال داغا وہ پھر بھی خاموش رہی۔

"ہاں ہوجاتا ہے۔ کبھی ایسے بھی کہ جب بندے کا دل چاہتا ہے کہ کوئی اسے چاہے' کوئی اس کے لیے مرے تو کوئی بھی نہیں وہ وقت گزر جانے کے بعد' بہت بعد پتا چلتا ہے کہ کوئی خوب چاہ رہا تھا' خوب ہی مر رہا تھا۔" زارا نے غالباً" کسی افسانے کے جملے دہرائے۔

"کیا بکواس ہے۔" اس نے بھنا کر کہا۔ "کس کم بخت کا دل چاہتا تھا کہ کوئی اس کے لیے مرے۔"

"اچھا!" زارا نے سر اٹھایا۔ "واقعی تو پھر علی بھائی بے چارے یونہی مر رہے تھے۔"

"مجھے کیا بھئی' مرتے ہوں گے میری بلا سے۔" اس نے سر جھٹکا۔ "عجیب مصیبت ہے ایک طرف کہیں یکسوئی حاصل ہی نہیں ہوتی۔" وہ پریشان سی ہوگئی۔

آپی اور مانی ماموں کو اسٹیشن چھوڑنے سے پہلے نوید اس کو چھوڑنے آیا۔ آپا ایک دم مہذب میزبان میں تبدیل ہوگئیں۔

"بی بی کا فون آیا تھا رات کو۔ کہنے لگیں سارا وہاں کیوں رک گئی۔ اسفند کو سحری کی تکلیف ہوگی۔" باتوں باتوں میں انہوں نے پھر بھی جتلوایا۔

"کیوں کیا اور کوئی روزہ نہیں رکھتا؟" آپی نے حیرت سے پوچھا۔

"کہاں مجھے تو گیس کی تکلیف ہوجاتی ہے خالی پیٹ۔ نسرین کے سر میں درد ہونے لگتا ہے۔ عاصمہ بے چاری کالج کی پڑھائی کی وجہ سے روزہ نہیں رکھ سکتی۔ زری کا تو تمہیں پتا ہی ہے۔ اسد کا کام بہت ہے۔ اب رہ گئے یہ دونوں میاں بیوی۔ اپنی مرضی کا پکاتے ہیں' کھاتے ہیں۔"

وہ بہت لگاوٹ' بہت محبت سے بول رہی تھیں۔ سارا ان کے لہجے پر چکرا کر رہ گئی۔ جو سحری وہ بناتی اور کھاتی تھی' اس کا حال اسے ہی معلوم تھا اور مانی ماموں کہتے تھے ان کی طرح سوچو' ان کی طرح جیو۔

"بی بی نے ویزا بڑھوالیا ہے اپنا۔ پہلے تو وہ اسفند کی محبت میں دوڑی آئی تھیں واپس۔ اب کہتی ہیں وہ خوش میں خوش۔"

وہ بتا رہی تھیں۔ ایک نیا صدمہ۔ اس کو امید تھی کہ بی بی کے آنے پر شاید اس کے دن بدل جائیں۔ وہ مزید کس بات پر صبر کرے۔

☼ ☼ ☼

امی نے فون پر تاکید کی تھی کہ عید پر وہ ضرور آئیں زارا جانے کے لیے تیار تھی جبکہ آپا کا کہنا تھا ہمارا اصول ہے بہو پہلی عید سسرال ہی میں کرتی ہے' عید کے دوسرے دن چلی جانا۔ زارا بھی اس کے لیے ایک دن ٹھہر گئی۔ زندگی میں یہ پہلی عید اتنی بے کیف اور پھیکی محسوس ہوئی تھی۔ صبح آپا کے رشتہ داروں اور ملنے والوں سے گھر بھر گیا۔ اسفند تیار ہو کر نماز پڑھنے کے لیے جو گھر سے نکلا تو شام کو واپس آیا۔ شام کو زارا اور نوید آگئے۔

"تمہارا گھر کتنا گندا رہتا ہے سارا! تم ہی کردیا کرو صفائی۔"

زارا نے پھلوں کے چھلکے کاغذ اور جوس کے پیکٹ بکھرے دیکھ کر کہا۔

وہ اتنے مختصر وقت کے لیے آتی تھی کہ اسے یہ جاننے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا کہ گھر میں اس کا عمل

دخل کتنا ہے۔ ویسے بھی اس کی طبیعت میں اتنی لاپروائی تھی کہ وہ بہت کم نوٹ کرنے والی باتیں نوٹ کرتی تھی۔

"سوو شیڈ کی لپ اسٹک ہے تمہارے پاس؟" زری بے تکلفانہ انداز میں اندر گھس آئی۔ وہ اکثر ایسی ہی ضرورتوں کے سلسلے میں اس کے کمرے میں آیا کرتی تھی۔

اس نے اسے غور سے دیکھا۔ زرق برق کپڑوں میں اس کا دن بدن پھیلتا وجود جگمگ کررہا تھا۔ اس نے بھاری میک اپ اور بھاری زیور پہن رکھا تھا۔ اس نے آہستگی سے اٹھ کر اپنا ویٹی باکس نکالا' جس پر گرد پڑ رہی تھی۔ چیزوں کے ہجوم میں زری کو اپنی مطلوبہ لپ اسٹک مل گئی تھی۔

"تم بھی تیار ہوجاؤ۔"

اس نے کمرے سے نکلتے نکلتے تکلفاً" کہا۔ صبح اس نے مہندی رنگ کا ہلکے کام والا سوٹ پہنا تھا۔ اسی کا دوپٹہ دوبارہ استری کرکے اوڑھا۔ بال بنائے اور ایک ہلکے سے رنگ کی لپ اسٹک ہونٹوں پر پھیرلی۔ ان چیزوں کا اسے پہلے بھی نہ شوق تھا نہ استعمال کرنے کا ڈھنگ آتا تھا لیکن اب تو اس کا دل ہی بجھ چکا تھا۔ چمکتی چمکاتی زری کے سامنے اس کا وجود ماند پڑنے لگا تھا لیکن اب اس کو ان باتوں کی پروا نہیں رہی تھی۔

رضیہ خالہ کے گھر میں سارے رشتہ دار موجود تھے ایک ہڑبونگ مچی تھی۔ رضیہ خالہ کی بہو اس سے باتیں کرتی رہی۔ اتنا عرصہ گزرنے کے بعد اور اتنی کوشش کے باوجود وہ اب تک ان کے لیے اجنبی کی اجنبی ہی تھی۔ رات کو بی بی کا فون آیا۔

"میں تو سوہنے سرکار کا شکر ادا کرتی نہیں تھکتی کہ اس نے مجھے' میرے اسفند کو تمہارے جیسا تحفہ دیا۔ سوہنا اور انمول۔ اسی لیے بیٹا! میں مطمئن تھی۔ تمہارے شگنوں والے قدم اس گھر میں پڑے۔ اسفند کا خیال رکھنے والا پیچھے کوئی تو ہے۔ وہ ذرا مختلف لڑکا ہے۔ تم نے اس کو خوش رکھا۔ میرا رب سچا تم سے خوش ہو۔ میرے پاک نبی سرکار صلی اللہ علیہ وسلم تم سے خوش ہوں۔"

اس سے بات کرتے ہوئے وہ کہہ رہی تھیں۔ دور بیٹھے وہ نجانے کیا سوچتی تھیں۔ اس کا دل چاہا وہ ان کو سچ سنا ڈالے' سب کچھ کہہ دے لیکن اس کے اردگرد کھڑے لوگوں کی نظریں اس پر جمی تھیں۔

☼ ☼ ☼

عید سے اگلے دن کا اسے پورا رمضان انتظار رہا تھا۔ نوید نے سیالکوٹ جانے کے لیے چھٹی لی تھی۔ جبکہ اسفند کو بقول اس کے چھٹی مل ہی نہیں سکتی تھی۔

"اسفند میرے خیال سے سارا' کراوڈ سے بھاگتا ہے۔" نوید نے راستے میں کہا۔ "تمہیں چاہیے تھا کہ تم اس کو زندگی کی طرف لاتیں' الٹا خود اس کی طرف ہوگئیں۔"

"اسی طرح چلتا ہے نا! دونوں ایک جیسے ہوں تو۔ اب میں اور آپ ایک جیسے نہ ہوتے تو کیسے چلتا۔"

وہ کہنا چاہتی تھی کہ وہ پوری کی پوری بھی اسفند کے جیسی ہوجائے گی تب بھی نہیں چلے گا۔

وہ تقریباً" تین ماہ کے بعد اپنے گھر آئی تھی۔ اسے لگتا تھا' یہ تین سال تھے یا پھر تین صدیاں۔ امی' ابا' بھابی بھائی سب خوش تھے کہ ایک عرصے کے بعد وہ تینوں بہنیں اکٹھی ہوئی تھیں۔ آصف بھائی بھی عید پر پہنچ چکے تھے۔ سجاد بھائی' آصف بھائی اور نوید کی محفل جمی رہتی۔ زبیر بھائی کو اپنے کاموں سے فرصت ملتی بھی ادھر آبیٹھتے۔

"کیا تھا سارا! جو اسفند بھی آجاتا۔" باری باری یہ جملہ سب نے ہی پوچھا تھا۔ وہ ان کو کیا جواب دیتی۔

"سارا! تم نے تو سب کچھ چھوڑ دیا۔ صرف چار چوڑیاں' کان' ناک' گلا خالی۔ اگر اسفند کو پسند نہیں ہے تو چلو یہاں تو پہن لو۔" بھابی نے کہا۔

"کاش اسفند کو کچھ ناپسند ہی ہوتا۔"

ان سب کے مسکراتے چہرے دیکھ کر اس کا دل چاہتا کہ وہ چیخ چیخ کر ان کو وہ داستان سنائے جو اس پر

گزری تھی۔ ان ان تجربات کا حال سنائے۔ جن سے وہ دوچار ہوئی تھی۔ سیاست، مکاری، چالبازی کے قصے جو اس کو ازبر ہو چکے تھے۔ اسے معلوم تھا کہ سب کو اس سے یہ سب سننے کی توقع نہیں تھی لیکن بے اختیار اس کا دل چاہتا وہ سب کو ایک ایک بات صفائی اور سچائی سے سنا دے لیکن وہ سب خوشیوں میں مشغول تھے گیٹ ٹوگیدر منا رہے تھے۔ یہ مواقع کم کم آتے تھے۔ وہ ان کی خوشیاں کیوں خراب کرے۔ جبکہ اس کو یقین تھا کہ ابا، سجاد بھائی، زبیر بھائی اس دھوکے بازی پر بھڑک اٹھیں گے۔ اس کے سسرال والوں کو گریبان سے پکڑ لیں گے۔ لیکن اسے یہ خوف بھی تھا کہ امی اسی کو قصوروار ٹھہرائیں گی۔

ان کے پاس بی بی کے خطوط باقاعدگی سے آتے تھے۔ وہی باتیں، وہی خلوص۔ امی کو کسی کی نیت پر شک کرنے سے نفرت تھی۔ وہ ایسا کر ہی نہیں سکتی تھیں۔ صبر اور جبر کے جو سبق وہ پڑھ چکی تھی اسے انہی کے مطابق عمل کرنا تھا کم از کم اس وقت تک جب تک بی بی واپس نہیں آجاتی تھیں۔ وہ کچھ کہے سنے بغیر لوٹ آئی۔

☼ ☼ ☼

سیالکوٹ میں گزرے دن خواب سے معلوم ہونے لگے تھے۔ لاہور کی زندگی وہی پرانی تھی۔ آپا کے تیور، باجی شمیم کی آمد بھابھی کے رنگ ڈھنگ اور زری کے نخرے۔ وہ سارا دن اللی کھاتی اور کھٹاس چوستی رہتی۔ اس نے بہت کچھ تقدیر کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا اور خاموشی سے ایک طرف ہو کر نظارہ کرنے لگی۔ وہ روز روز کی چخ چخ کی عادی ہو گئی تھی۔ گھر میں گند پڑا ہے، پڑا رہے اس کی بلا سے، کچن الف سے یے تک غلیظ ہو رہا ہے، ہوتا رہے۔ ہاتھ روم دوبارہ سے گلی زدہ ہو گیا۔ وہ اس سوچ سے ماورا ہو چکی تھی۔ اسفند کی خاموشی زندگی کا حصہ بن گئی تھی۔ اس نے بہت مدت کی کوشش کے بعد ہتھیار پھینک دیے۔

بی بی کا ویزا ایکسٹنڈ ہو گیا۔ موسم بدلتے رہے، وہ گھر میں ایک کونے میں پڑی رہتی۔ زارا اس کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آتی تو خاموشی سے چل دیتی۔ اس کے ہونے یا نہ ہونے سے اس گھر میں کسی کو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

امی اپنے پاس بلاتیں تو وہ ادھر آجاتی۔ نہ کسی نے منع کیا تھا نہ اجازت دی تھی۔ اسے اپنے زندہ ہونے پر شک ہونے لگا۔

"سارا! کسی گائنا کالوجسٹ کے پاس چلو۔" زارا یا امی اس سے کہتیں تو وہ بے تاثر چہرہ لیے ان کو دیکھتی رہتی۔

"مجھے گائنا کالوجسٹ سے زیادہ کسی سائیکاٹرسٹ کی ضرورت ہے۔" اس کا دل چاہا کہے۔

وہ جس صبر اور قناعت کی عادی ہو چکی تھی۔ ایک روز وہ یکایک اس کا ساتھ چھوڑ گئی۔ وہ ایسا نہیں چاہتی تھی لیکن یہ سب اتنا اچانک ہوا تھا کہ وہ خود ششدر رہ گئی۔

* * *

اس روز باجی شمیم صبح صبح آگئی تھیں۔ پکی پھپھی سے خالہ رضیہ کل سے آئی ہوئی تھیں۔ سردیوں کی دھوپ میں پچھلا صحن ان کی محفل کا ٹھکانہ بنا ہوا تھا۔ وہ کپڑے دھو کر پھیلانے کے لیے باہر نکلی۔

"آپا! یہ تم نے کیا بوجھ سر پر بٹھایا ہوا ہے۔" خالہ رضیہ نے کینو کی پھانک منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

"ہی ہی ہی۔" کھری چارپائی پر کروٹ کے بل لیٹی زری نے دانت نکالے۔

"ہاں تو اور کیا نہ کوئی حاصل نہ وصول۔ نری بنجر زمین کھاؤ پٹ۔" خالہ رضیہ نے توجیہہ پیش کی۔ بالٹی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ وہ کمزور ہو رہی تھی اور اس کا دل بہت جلد گھبرا جاتا تھا۔ ایک دم احساس تذلیل نے اس کے اندر شرارے سے بھر دیے۔

"میں خود نہیں آئی تھی۔ سارے الزام مجھے لانے والے پر رکھیں۔" ایک برس کی بند زبان نہ جانے کیسے پھسل گئی۔

"جاؤ جاؤ، اس کا نام نہ لو۔ وہ کسی گناہ کا شریک نہیں۔" باجی شمیم کا پسندیدہ لمحہ ہاتھ آیا تھا۔ وہ کڑی

ہو گئیں۔

"ہونہہ! کی تم بی بی کی لاڈلی۔ فقیروں کے خاندان سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔" آپا پیچھے کیسے رہتیں۔

"آپ میرے خاندان کو، میرے ماں باپ کو کچھ نہیں کہہ سکتیں۔" اتنی سی بات پر ہی اس کا سانس پھول گیا۔

"لو جی، ایک سال سے ہم نے برداشت کیا ہوا ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی واسطہ رکھنا پڑتا ہے کہ گھر میں رہتی ہے۔ ہر دوسرے دن کوئی اس کے پیچھے آجاتا ہے۔ ہر دوسرے دن یہ اٹھ کر چلی جاتی ہے۔ اوپر سے تو میرے خاندان کو کچھ کہہ نہیں سکتیں۔" باجی شمیم نے واقعی بازو چڑھا لیے وہ جانتی تھی کہ ان کی فطرت اور ان کی سرشت میں یہی کچھ ہے۔

"منہ کو کیسے آتی ہے بنجر زمین!" خالہ رضیہ جلتی پر تیل کا کام سرانجام دینے لگیں۔

"میں بنجر زمین نہیں ہوں، اپنے بیٹے سے یہ سوال کریں۔" اپنی محرومی، شکست اور غم سے اس کا لہجہ بھرا گیا۔ وہ کس حد تک نیچے جا سکتی ہیں۔ اسے اس کا بھی اندازہ تھا۔

"دفع دور، اپنے بیٹے سے پوچھیں۔ ارے وہ تو جوتے کی نوک پر نہیں رکھتا تمہیں۔ تمہارے چہرے پر نگاہ تک نہیں ڈالتا۔ تم سے بات کرنا پسند نہیں اس سے کیا پوچھیں؟ لو جی لو۔ چپ رہیں تو سر چڑھ آتی ہیں۔"

آپا تو واقف حالات نہیں تھیں یہ اس کی غلط فہمی تھی کہ اس نے ایک راز دل میں چھپایا ہوا ہے۔ اس کی بے پردگی نے اسے آگ لگا دی پھر اس کے منہ میں جو آیا اس نے کہہ دیا۔ گزرا ایک سال، اس کا ایک ایک دن ان کا دھوکا، ان کے فریب، اس کا احساس زائل ہونے کو نہیں آرہا تھا۔

نہ جانے اس میں اتنی ہمت کیسے آئی۔ اس نے کپڑے بیگ میں ڈالے۔ کس طرح رکشا پر بیٹھ کر آئی اور کیسے وہ سیالکوٹ تک اپنے گھر پہنچی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ گھر میں سب ہی اس کے اچانک اور اکیلا آنے پر بوکھلا گئے تھے۔

"میرا دل چاہ رہا تھا آکر یہاں رہنے کو۔ اسفند نے کہا اب چلی جاؤ سو میں آگئی۔" اس نے سب کو جھوٹی تسلی دی۔ سب نجانے کیسے مطمئن ہو گئے۔

"کوئی اس سے کچھ نہ پوچھے، کوئی اس سے کوئی سوال نہ کرے۔" اس کا یہی دل چاہتا تھا۔ لیکن پھر زارا کا فون آگیا۔

"تم کیسے چلی گئیں؟ تمہاری ساس کہہ رہی تھیں، ہمیں نہیں پتا کہ کیوں اور کہاں چلی گئیں وہ سب پریشان تھے اسفند بھی۔" وہ کہہ رہی تھی۔

"وہ جانتے تھے کہ میں کہاں اور کیوں جا رہی ہوں، تمہارے سامنے شو کر رہے ہوں گے۔"

اس نے سکون سے جواب دیا۔ وہ شعلے جو اس روز اس کے وجود میں بھڑک اٹھے تھے گھر کے پر سکون ماحول میں ٹھنڈے پڑنے لگے تھے۔ جلد بازی یا بے صبری میں وہ جو فیصلہ کر چکی تھی اسے اس کے منطقی انجام تک پہنچانے کے لیے وقت درکار تھا سوچنے کی خاطر۔ زارا کے فون نے سب کو مشکوک کر دیا۔ وہ خود اس کے جملے پر حیران تھی۔

"سب پریشان تھے اسفند بھی۔" اسفند کو کیا سروکار کہ وہ کہاں ہے؟

"کیا لڑ آئیں سارا! اسفند سے؟" بھابھی نے بظاہر بہت سہولت سے پوچھا تھا۔

"نہیں اسفند سے میری کیا لڑائی؟" ایسا واقعی نہیں ہوا تھا۔

"تو کیا ساس نندوں سے لڑائی ہو گئی؟" اسی سہولت سے دوسرا سوال پوچھا۔

"لڑائی تو نہیں لیکن کچھ باتیں جو شاید ان کو اور شاید مجھے بھی بری لگیں۔" بھابھی کی عدالت میں اس کی پیشی بہت کڑی ثابت ہو رہی تھی۔

"رہ لینے دو سارا کو کچھ دن، ذرا ماحول تبدیل ہو جائے گا۔" ابا اس کی خاموشی کی زبان سمجھتے تھے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر اسے سوالات کی یلغار سے بچایا۔

"اس کے محلے میں حمید صاحب کی بیٹی کلثوم آپا رہتی تھیں ان کو سسرال اور خاوند راس نہیں آئے تھے۔ وہ بھی واپس آبیٹھی تھیں۔ سارا ان کی مثال سامنے رکھ کر واپس آئی تھی۔ اور پھر ایک دفعہ اس نے سنا تھا کہ علی نے کہا تھا کہ "اب مجھے کہیں اور شادی نہیں کرنا" وہ بہت عرصہ کے بعد خوش فہمیوں کا شکار ہوئی تھی۔ اس کے ذہن کو سکون ملنے لگا۔

یہاں نہ تو اسے لوگوں کی طنزیہ باتوں اور پھٹکار کا سامنا کرنا پڑتا نہ ناقابل برداشت گندگی نظر آتی۔ نہ ہی کئی دن کے باسی کھانے کھانے کو ملتے نہ ہی ہر وقت کانوں میں گونجتے پنجابی گانوں کے کیسٹ برداشت کرنا پڑتے تھے۔ نہ ہی سر پر لٹکتا خاموش وجود دیکھنے کو ملتا۔

وہ ایک بار پھر زندگی کی طرف لوٹنے لگی۔ اس نے جمع کیے ہوئے رسالے اور کتابیں پڑھنا شروع کیں۔ بھابھی کے ساتھ کچن میں مصروفیت ڈھونڈی۔ امی کے بہت سی کام اپنے سر لے لیے۔ ابا کی باتوں میں دلچسپی لینا شروع کی۔ زبیر بھائی کی مصروفیات میں جھانکا۔ جاوید کی باتوں میں پناہ ڈھونڈی۔ لیکن اسے محسوس ہو رہا تھا کہ جوں جوں اس کا قیام بڑھتا جا رہا تھا۔ تقریباً سب لوگوں کے چہرے سوالیہ نشان بنتے جا رہے ہیں۔ سب سے پہلا احساس اس کو بھابھی نے دلایا۔ وہ اپنے میکے سے واپس آئی تھیں۔ اس نے ان کی چھوٹی بہن نائلہ کا ان سے پوچھا۔

"ٹھیک ہے آج کل امی کی طرف آئی ہوئی ہے۔ میں نے کہا بہت رہ لی۔ اب جاؤ واپس تو کہنے لگی۔ میں تو رہوں گی ابھی میں بہت تھکتی ہوں۔ سارا ابھی تو رہ رہی ہے کب سے میکے۔"

انہوں نے بظاہر ہنس کر کہا تھا لیکن اسے معلوم تھا کہ وہ اس کو سنانے کو کہہ رہی ہیں۔

"ابا اپنے کام کرتے چلتے پھرتے بہت پرانا مصرع گنگنانے لگے

مگر ایک وہ شاخ نہال غم جسے دل کہیں' وہ ہری رہی

"جب میں پریشان ہوتا ہوں' یہ مصرع خود بخود میری زبان پر آجاتا ہے۔" ایک بار انہوں نے کہا تھا۔

"اسے کیا کرنا ہے؟ اسے کیا کرنا چاہیے۔" برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھے اس نے دس ہزار مرتبہ سوچا۔ اس کی سسرال والوں نے پلٹ کر اس کی خبر نہیں لی تھی اسفند کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ زارا کی طبیعت خاصی خراب رہتی تھی۔ وہ گھر سے باہر نہیں نکلتی تھی' اسی لیے اس کے فون میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں ہوتا تھا۔ بی بی نے امی کو لمبا چوڑا خط لکھا تھا جو انہوں نے کسی کو نہیں دکھایا تھا۔ ان کا دو بار فون آیا تھا' وہ ان کا نام سنتے ہی کمرے سے بھاگ جاتی تھی۔

اس گھر اور اس گھر کے مکینوں کا تصور ہی اسے خوفزدہ کر دیتا تھا۔ آپا کا چہرہ اس کی نظروں کے سامنے آیا تو وہ جھرجھری لے کر سیدھی ہو گئی۔ لان میں سیمنٹ کا چھوٹا سا تخت بنا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہوئے اسے بہت سی باتیں یاد آگئیں۔ مانی ماموں یہاں بیٹھ کر اسے اور زارا کو بہت کچھ سنایا کرتے تھے۔ جب وہ کالج میں تھے؟

"ہم موسیقی جنم دینے والے ہیں۔ ہم خوابوں کے خواب میں آوارہ پھرتے ہوئے وحشت زدہ سمندر کی موج کے ساتھ اور اداس ویران چشموں کے پاس بیٹھے ہوئے۔ دنیا کو ہارے ہوئے شکست خوردہ اور دنیا سے تعلق رکھنے والے۔

اس کے کانوں میں مانی ماموں کی آواز بازگشت کر گونجی۔ زارا کو نظم پسند نہیں تھی' وہ اپنے کانوں کے سوئچ آف کر لیتی۔

"وہ سنائیں' وہ ٹینی سن۔"

ان کے خاموش ہونے پر وہ چونک کر متوجہ ہوتی۔

چند دن پہلے اس کی ساری داستان صرف انہوں نے ہی سنی تھی۔

"میں نے کمروں میں پھول لگانا چاہے تو آپا بولیں پھول مزاروں پر چڑھانے کے لیے ہوتے ہیں۔" آپا نے کہا تھا۔

"تم نے ان کو سمجھایا نہیں کہ نہیں یہ سجانے کے لیے بھی ہوتے ہیں۔" انہوں نے رسان کے ساتھ

پوچھا۔

"میں نے کاٹن خریدا تو باجی شمیم کہنے لگیں۔ آگئیں اپنی اوقات پر۔"

"بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے' ہر بات پر اعتراض کرنے کی۔ ان کو معاف کر دینا چاہیے۔"

"میں نے کہا کہ میرا سامان خراب ہو رہا ہے۔ اوپر نیچے پڑا ہوا تو آپا کہنے لگیں۔ اپنا گھر دیکھا ہے۔ اس کمرے کے برابر تو تمہارے گھر کے تین کمرے ہیں۔"

"تم نے petti fogging کا لفظ تو سنا ہوگا۔ یہ بھی ایک عادت ہوتی ہے۔"

"اسفند نے مجھ سے آج تک کوئی بات نہیں کی۔" اس نے اصل اور بڑی وجہ بتائی۔

"تم نے اس کی وجہ پوچھی؟" اس نے وجہ کبھی نہیں پوچھی تھی' اس کے جواب میں اس کے پاس صرف خاموشی تھی۔

"یہی ناموافق حالات تو تھے جن کے لیے وہ پڑھنا چاہتی تھی' کچھ سیکھنا چاہتی تھی۔"

"جب انسان کی زندگی میں یہ شادی والا موڑ آتا ہے تو وہ بدل جاتا ہے۔ اس کے اندر کا پہلا انسان مر جاتا ہے۔ نہ کہیں جنازہ اٹھتا ہے نہ مزار بنتا ہے مگر وہ مر جاتا ہے۔ پھر اس مرقد کی خاک سے نیا خمیر تیار کرتا ہے۔ سارا اس نئے خمیر کی تیاری کرتا ہے۔ کچھ کے لیے یہ کام بغیر کوئی دقت اٹھائے خود ہی خود ہو جاتا ہے' جیسے زارا کے ساتھ ہوا کچھ کو مشکل پڑتی ہے۔ مگر ہر نئی تبدیلی کے ساتھ کمپرومائز تو بہرحال کرنا ہی پڑتا ہے۔"

وہ کہہ رہے تھے۔

"سارا اتنے دن سے سیالکوٹ کیوں بیٹھی ہے واپس کیوں نہیں جاتی؟" آپی کا خط آیا تھا۔

"لیکن آسودگی اور اطمینان بھی تو ہو۔" وہ کمپرومائز کرنے کے سارے گر آزما کر ناکام ہو چکی تھی۔

"آسودگی اور اطمینان وہاں ہوتے ہیں' جہاں زندگی کے دن پورے ہونے کو آچکے ہوتے ہیں۔ اس چلتی پھرتی دوڑتی بھاگتی زندگی میں آسودگی اور اطمینان کے کیا معنی ہیں؟"

اس نے حیرت سے مانی ماموں کو دیکھا تھا یہ وہی مانی ماموں تھے جو کبھی کہا کرتے تھے۔

"ہم کسی کو ناصح سمجھیں اور خود کس کو نصیحت کریں۔" آپ کیسے مزے سے اس کو نصیحت پر نصیحت کیے جا رہے تھے اور جب زارا ان کو ٹینی سن سنانے کو کہتی تو وہ کتنے مزے سے گنگناتے۔ وہ پھر ماضی میں کھو گئی۔

"پرانے کو جانے دو' نئے کو آنے دو۔

افق کے اس پار سے خوشیوں بھری جھنکار آرہی ہے۔ سال جا رہا ہے اسے جانے دو غلط کو جانے دو نئے کو آنے دو۔

"Ring in the new ring out old" بار بار یہ فقرہ اس کے دماغ پر ہتھوڑے برسانے لگا۔ اور وہ دن کتنے مزے کے تھے جب مانی ماموں اور سجاد بھائی ہماری ساری فرمائشیں پوری کیا کرتے تھے۔ آئس کریم کھلاتے کولڈ ڈرنک پلاتے۔ نظمیں اور کافیاں سناتے ان کے ساتھ کرکٹ کھیلتے۔ کوڑا جمال شاہی پیچھے دیکھا مار کھائی۔

پیچھے دیکھا مار کھائی۔

"بھائی کتنی دیر ہنسا سکتے ہیں' آج خوش ہیں کل غصہ آجائے گا۔ خود کو عذاب میں نہ ڈالو وہاں جیسا ہے' اسی میں گزارا کرو۔" کلثوم آپا کہتی تھیں یہی ان کا تجربہ تھا۔

جاوید سجاد بھائی کے مانی اور اس کے دوستوں کو کھلا رہا تھا۔

کوڑا جمال شاہی پیچھے دیکھا مار کھائی پیچھے دیکھا مار کھائی۔

"ہمیں اس ماضی کو یاد کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔" اس نے سارے خیالات جھٹک دیے۔

"یہ غلطی نہ کرنا سارا! یہ فیصلے جلدی اور جذباتی ہو کر کرنے کے نہیں ہوتے۔" کلثوم آپا نے اس کی

بات بن کر کہا تھا۔

"علی کی شادی طے ہو گئی ہے۔" ایک روز خط آیا تھا۔ کس امید پر مستقبل داؤ پر لگا بیٹھی تھی۔

"تمہیں اپنے ماں باپ کو لیٹ ڈاؤن کرنے کا کوئی حق نہیں ہے آپا کی طرف دیکھو جب سے تم یہاں آئی ہو وہ دن بدن کمزور ہوتی جا رہی ہیں۔ انہی کا خیال کرو۔"

علی ماموں کے جملے اس کا پیچھا نہیں چھوڑ رہے تھے۔ وہ باہر سے اٹھ کر اندر آ گئی۔ گرمیوں اور رمضان کی آمد آمد نے اسے بھولی بسری باتیں یاد دلائیں۔ زری اور زارا دونوں کے ہاں بیٹے پیدا ہوئے تھے۔ بھابھی زارا کے پاس چلی گئی تھیں۔ ان کی عدم موجودگی میں اس نے گھر کا انتظام سنبھالا ہوا تھا۔ سب کے لیے سحری بناتے ہوئے اسے اسفند کا خیال آیا۔ اس کے لیے سحری کون بناتا ہوگا؟ "اسے تو کبھی میری یاد بھی نہ آئی ہوگی۔" پچھلے دنوں زری کی بیٹے کی پیدائش پر امی نے خود آپا کو فون کیا تھا۔ آپا انجان اور بے گناہ بن گئیں۔

"بات یہ ہے کہ سارا کا دل ہی نہیں لگا۔ ہم سے تو قسم لے لیں جو پھولوں کی چھڑی سے بھی چھوا ہو۔"

ان کے وہ عمل جو وہ سب کے سامنے دکھاتی تھیں۔ ان پر کوئی الزام لگا ہی نہیں سکتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی وجہ سے گھر کا ماحول دن بدن ٹینس ہوتا جا رہا ہے۔ امی اس کا چہرہ دیکھتے ہی پریشانی کی دو گولیاں زبان تلے رکھ لیتی تھیں۔

"اور کسی کا نہیں اپنی امی ہی کا خیال کر لو۔" ایسے موقع پر اسے علی ماموں کی بات یاد آتی۔

"مگر وہ اک شاخ نہال غم جسے دل کہیں۔"

ابا شدومد سے دہرانے لگے تھے۔ اس روز امی کا بلڈپریشر بڑھ گیا۔ سب ہی پریشان تھے۔ اس روز ہی اس نے عذاب محرومی، دکھ پریشانی اور ذلت کے گھرے جنگل میں واپس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ امی کی خاطر ابا کی خاطر وہ اپنے سارے خواب آنکھوں سے نوچ کر پھینک سکتی تھی۔ رات کے دس بجے اس کی انگلیاں لاہور کا نمبر ڈائل کر رہی تھیں۔ اسے معلوم تھا کہ اس وقت تک صرف اسفند ہی جاگ رہا ہوتا ہے۔ کچھ دیر بعد وہی آواز گونجی جسے اتنا کم سننے کے بعد بھی وہ لاکھوں آوازوں میں سے پہچان سکتی تھی۔

"میں آپ کو ناگوار خاطر ہونے کے باوجود غیر مشروط طور پر واپس آنا چاہتی ہوں کیونکہ مجھے بہت سی زندگیاں اور ان کی خوشیاں عزیز ہیں آپ سے میری صرف اتنی درخواست ہے کہ خود آ کر مجھے لے جائیں۔ میں اپنے ماں باپ کو ایک بار پھر غلط فہمی میں مبتلا کر کے خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔"

اس نے بلا تمہید کہنا شروع کیا۔ جواب میں ایک گہری سانس کے ساتھ فون بند کر دیا گیا۔ اس نے ایک دکھ اور خود کو لگا لیا تھا۔ وہ جیسے آئی تھی ویسے ہی چلی جاتی فون کر کے جو غفلت ہوئی تھی۔ اس سے تو بچ جاتی۔ میرے وہاں ہوتے اسے کوئی پروا نہیں تھی تو اب کیوں ہو۔

اگلے دن غیر متوقع طور پر بی بی آ گئیں۔

"میں صدقے میری جان تجھ پر کیا بیت گئی۔"

انہوں نے اس کا ماتھا چوم لیا۔

"ہائے بہن! میں خوش تھی کہ رب سچے کی رضا سے میری مراد پوری ہوئی۔ پر مجھے کیا پتا تھا کہ جلنے والوں کے منہ راکھ پڑ گئی۔ سب ٹھیک ہو جائے گا میرے پاک پروردگار کے کرم سے میں لے کر گئی تھی میں ہی اس سے چھنی عزت دوبارہ دلواؤں گی اسے اپنا سامان باندھو بیٹا!" انہوں نے اسے سوچنے کی مہلت نہیں دی۔

World looser sand world for sakes"

اس کے کانوں میں یہی جملہ گونج رہا تھا۔

"آج انتیسواں روزہ ہے میرے پروردگار کا کرم ہوا تو عید اپنے گھر ہی کرو گی تم۔" راستے میں انہوں نے کہا۔ وہ ہر قسم کے حالات کے لیے خود کو تیار کر چکی تھی۔ ہر قسم کے تجربے کا مزا چکھ چکی تھی۔ اب اس کو اپنی زندگی خود بنانا تھی۔ بہتر یا بدتر۔

گھر ویسے کا ویسا تھا جیسا وہ چھوڑ کر گئی تھی اور غالباً دل بھی ویسے ہی تھے۔ اسی سرد مہری نے اس کا استقبال کیا۔ جس نے ڈیڑھ سال قبل اس کی پہلی بار قدر پر کیا تھا۔ اس کا کمرہ بھی ویسے کا ویسا تھا۔ صرف اسفند نا وقت موجود تھا۔

"لو بیٹا! میں لے آئی ہوں پر یاد رکھو اتنا وقت سوچنے میں نہیں لگاتے۔ وہ میرا آسمان زمین کی وسعتوں جتنی بخشش والا پروردگار بھی ناراض ہو جاتا ہے کبھی کبھی۔" بی بی نے اسے کمرے کے وسط میں کھڑا کر کے اسفند سے کہا اور خود باہر نکل گئیں۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا سارا! کہ تم سے کیا کہوں؟" وہ بول رہا تھا۔ وہ گم صم کھڑی تھی۔

"پہلے تو میں بی بی سے ناراض تھا انہوں نے مجھ سے پوچھے بغیر تمہارا انتخاب کر لیا۔ بی بی سے ناراضی کے بجائے تم سے لاشعوری طور پر ناراض رہا۔ جبکہ تمہارا کوئی قصور نہیں تھا۔ اس کے لیے تم سے معذرت کیسے کروں پھر مجھ پر آپا کی نفسیات کا بڑا بوجھ تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ ان سے دور ہو کر میں نے ان کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ میں نے ان کے قریب ہونے کی کوشش کی۔ تم ان کی پسند نہیں تھیں۔ میں یا ان کو اپنا تا یا تم کو۔ میں کس ذہنی کشمکش سے گزرا ہوں۔ شاید تم کو اندازہ نہ ہو" میں چاہتا تھا کہ اگر میں تمہارے حق میں فیصلہ نہ کر سکا تو تم اسی طرح جاؤ جیسے یہاں آئی تھیں۔ میں ہر معاملے میں ایمان داری کا قائل ہوں زبردستی کا نہیں لیکن یہ میرا ذاتی معاملہ تھا میرا بیڈ روم انیٹرنسی باہر والے کو یہ حق نہیں پہنچتا تھا کہ اس میں ٹانگ اڑائے یا تم پر کوئی الزام لگائے۔ خواہ وہ میری ماں ہی کیوں نہ ہو۔ اس روز تمہارے ساتھ جو کچھ آپا اور دیگر لوگوں نے کیا اس نے میرا سر کتنا جھکایا یہ وہ سوچ بھی نہیں سکتیں۔ تم نے جو کیا درست کیا۔ ان حالات میں کوئی بھی ہوتا یہی کرتا۔ تم نے جس حوصلے اور صبر کے ساتھ یہاں دن کاٹے اس نے مجھے تمہارا معترف کر دیا۔ لیکن جب میرا فیصلہ تمہارے حق میں ہونے لگا۔ تم غائب ہو گئیں۔ تم نے ٹھیک کہا تھا اپنے علی ماموں سے کہ تم کس کے ریفرنس سے یہاں رہتیں۔ میں تم سے اتنا شرمندہ تھا کہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ معذرت کن الفاظ میں کروں پھر تمہارا ابھی پوچھنا نہیں تھا میں نے تمہیں دیا ہی کیا تھا جو تم سے کسی رعایت کا طلب گار ہوتا۔ صرف اتنا مجھے معلوم ہے کہ تمہارے جانے کے بعد میں زندگی سے دور اور لوگوں سے بددل ہوتا چلا گیا۔ تمہارے کل رات کے فون نے میرے اندر ایک نئی روح پھونک دی۔ بی بی پرسوں سے آئی ہوئی ہیں۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ تم سے کہیں تم اگر منتیں بھی کروانا چاہتی ہو تو میں تیار رہوں لیکن تم تو بہت وسیع القلب نکلیں سارا! مجھے بی بی کے انتخاب پر فخر ہے۔"

وہ اتنی طویل گفتگو کر رہا تھا وہ بے یقینی سے اسے دیکھتی رہی۔

"اب تم میرے ریفرنس سے رہو گی اپنے گھر میں۔ ہم یہاں نہیں رہیں گے۔ میں نے گھر کے لیے درخواست دی تھی جو منظور ہو گئی۔ میں تم اور بی بی اس ماحول سے دور نئی زندگی کا آغاز کریں گے گزرے لمحوں کی تلافی کے لیے یہ کوئی بڑی قربانی نہیں ہے دیکھو غالباً عید کا چاند نظر آ گیا ہے۔" باہر سے اٹھتے شور کی آواز پر اس نے کہا۔

"آؤ عید کا چاند دیکھتے ہوئے دعا مانگیں گزرے دنوں کے نقوش چھٹ جانے کی" آنے والے دنوں کی مسرتوں کی دعا۔"

اس نے سیونگ مشین کا ڈبہ ہٹا کر کھڑکی کھولتے ہوئے کہا۔ رفتہ رفتہ بے یقینی کی کیفیت اس پر سے زائل ہونے لگی اور اسے یقین آ گیا کہ عید کا چاند اسے نوید دے رہا ہے کہ اس کو بازو کے گھیرے میں لیے دعا مانگتا یہ شخص اب اس کی پہنچ سے باہر نہیں رہا۔ اس تک پہنچنے کے لیے اسے کن صحراؤں سے گزرنا پڑا تھا۔

اس سال کی نوید عید کے ساتھ وہ بھی بھلا دینا چاہتی تھی۔

"میرا رب سچا دیر سے سہی مفضل کرتا ضرور ہے یہ تجربہ بھی تو زندگی کا حصہ ہیں۔"

اسے بی بی کی بات پر یقین آ گیا تھا۔

☼